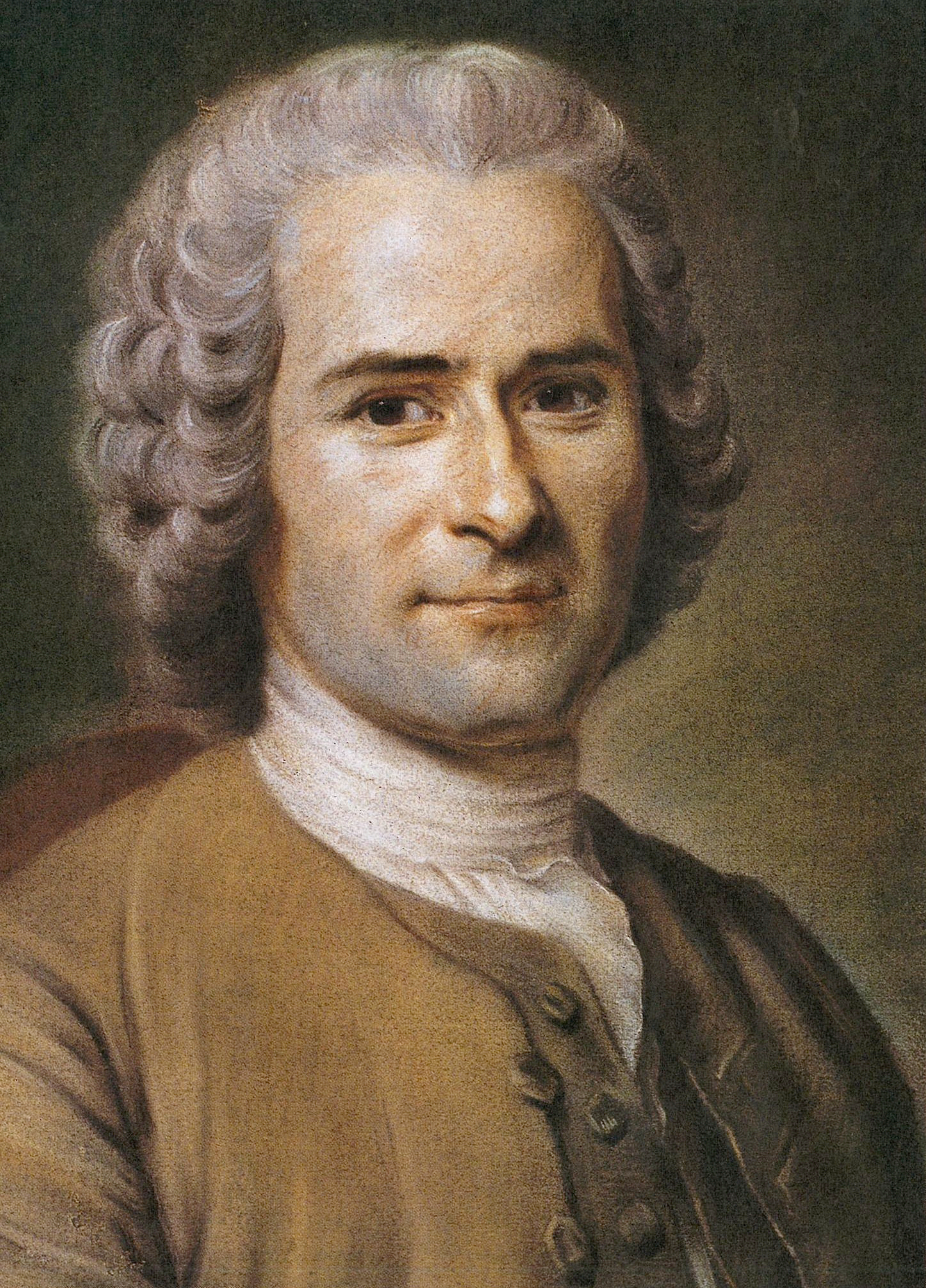

روشن خیال

تحریر : ڈاکٹر ساجد امجد

فطری طور پر سادہ، ذاتی طور پر مفلس لیکن بلا کا خوددار۔ رسمی تعلیم سے بے بہرہ لیکن نظامِ تعلیم تشکیل دینے کا اہل۔ وہ ماں باپ کی محبت اور سائے سے محروم رہا لیکن تشنگی کا احساس تک نہ تھا۔ مذہب سے انسیت رکھتا تھا مگر اپنے ہی مذہب کو ''غلامی کا سبب'' قرار دیتا تھا۔ اس نے نا انصافی کو معاشرتی انتشار کی سب سے بڑی طاقت قرار دیا کیونکہ اس نے ہمیشہ زبردستوں کو زیردستوں کا استحصال کرتے پایا۔ اس کے علاوہ اس نے ادب، شاعری اور موسیقی میں نمایاں مقام پایا مگر اس کے باوجود اس کی ساری زندگی حالات کی گردش میں گزری۔

اپنے انقلابی فلسفیانہ نظریات سے دنیا کو حیران کردینے والے ''روسو'' کی سرگزشت

آئزک گھڑی ساز تھا۔ شاید اسی لیے گھڑی کی سوئی کی طرح ہمیشہ گردش میں رہتا تھا۔ وطن میں رہ کر بھی جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی یہ عادت اس کے لہو کا حصہ بھی ہوسکتی تھی۔ اس کے اجداد میں سے کوئی شخص پیرس سے ہجرت کرکے جنیوا میں آباد ہوگیا تھا۔ آئزک ہجرت کی اسی عادت کو اپنی شخصیت کا حصہ بنائے شہروں شہروں گھوم رہا تھا۔ اس کے خاندان والوں نے گھڑی کی چابی کو الٹا گھما کر یہ چاہا کہ کسی طرح اس کی گردش تھم جائے۔ اس کی شادی سوزین برنارڈ سے کردی گئی۔ گردش واقعی تھم گئی۔ وہ حسین سوزین کی زلفوں میں الجھ گیا۔ گھڑی ساز تھا' جم کر بیٹھا تو بہت سا کام آنے لگا۔ سوزین کے لیے تحفے خریدنا اس کا مشغلہ تھا جس کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ وہ دن رات گھڑیوں کی مرمت میں مشغول رہنے لگا۔ سوزین کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ وہ کتابیں پڑھتی رہتی۔ آئزک کام کرتا رہتا۔ ڈھیر سارے دن پھولوں پر چلتے ہوئے گزر گئے۔ پھر ایک دن سوزین نے اسے خوش خبری سنائی۔

''آئزک! مبارک ہو' تم باپ بننے والے ہو۔''

''تم سچ کہہ رہی ہو یا مجھے پریشان کرنا مقصود ہے؟''

''اس میں پریشانی کی کیا بات ہے' تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔''

''میں نہیں چاہتا کہ تمہارا حسن ماند پڑ جائے۔''

''ماں بننے کے بعد عورت اور زیادہ حسین ہوجاتی ہے۔''

''میں اپنی محبت میں کسی کو شریک دیکھنا نہیں چاہتا۔''

''آئزک! میں تو تمہاری باتوں سے ڈرنے لگی ہوں۔''

''تمہیں ڈرنا بھی چاہیے'' آئزک نے کہا اور اپنا غصہ چھپانے کے لیے اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔

یہ پہلا موقع تھا جب اس نے سوزین کو اس طرح نظرانداز کیا تھا۔ سوزین سر سے پاؤں تک کانپنے لگی۔ آنے والا مہمان اسے خطرے کا پیش خیمہ نظر آنے لگا۔ وہ پادری کی بیٹی تھی۔ اس کی تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی تھی۔ گناہ' ثواب سے واقف تھی ورنہ شاید اس مہمان سے پیچھا بھی چھڑا لیتی۔ اب ایک ہی راستہ اس کے سامنے تھا کہ کسی طرح آئزک کی خفگی کو دور کیا جائے۔ یہ کام اس کے لیے مشکل نہ تھا۔ آئزک جھگڑالو تھا لیکن اس کی اداؤں کے سامنے بے بس ہوجاتا تھا۔ اس کا اندازہ ٹھیک نکلا۔ آئزک نے آنے والے وقت سے بہت جلد سمجھوتا کرلیا۔

وقت نے فاصلہ طے کیا اور سوزین نے ایک بیٹے کو جنم دے دیا۔ آئزک کا دبا ہوا غصہ ابھر آیا۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ پیدائش کے بعد سوزین بیمار پڑ گئی۔ اب آئزک کو سمجھانے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کا غصہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس نے سوچا جب وہ ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی سوزین سے دور ہے تو جنیوا چھوڑ کر کہیں اور کیوں نہ چلا جائے۔ اسے سیاحت پر نکلے ہوئے دن بھی بہت ہوگئے تھے۔ ایک روز خاموشی سے گھر سے نکلا اور چپکے سے جنیوا چھوڑ دیا۔

سوزین کو یہ تو معلوم تھا کہ وہ کیوں چلا گیا ہے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ کہاں چلا گیا اور کب آئے گا۔ آئزک کے اہلِ خاندان اس کی عادت سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ وہ اپنی مرضی سے جاتا ہے' اپنی مرضی سے واپس آتا ہے۔ ان سب نے سوزین کو بھی سمجھا دیا۔ وہ اب کر بھی کیا سکتی تھی۔

اسے تو اب انتظار کرنا تھا۔ یہ انتظار طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا۔ پھر وہ تنگ آ کر اپنے باپ کے گھر منتقل ہوگئی۔

آئزک اس سے خفا ہو کر نہیں گیا تھا۔ ایک چکر تھا جو اس کے پیروں سے لپٹا ہوا تھا۔ وہ اتنے دن جم کر بیٹھ گیا' یہی بہت تھا۔ وہ بے حس بھی نہیں تھا اور ایسا بھی نہیں تھا کہ اسے سوزین سے نفرت ہوگئی ہو۔ ایک دن اس نے سوزین کو خط لکھا۔ وہ قسطنطنیہ میں تھا اور اپنا کاروبار جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سوزین کے لیے بارش کا یہ قطرہ بہت تھا لیکن وہ سیراب تو اس وقت ہوتی جب آئزک اس کے پاس چلا آتا۔ وہ تقاضے کرتی رہی لیکن آئزک آنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

جنیوا میں ایک نیا ریزیڈنٹ تعینات ہوا تھا۔ خوبصورت بھی تھا اور نوجوان بھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ سوزین کے باپ پادری ایم برنارڈ کا عقیدت مند تھا۔ کبھی کبھی اس سے ملنے آجاتا تھا۔ ایک روز اس کی نظر سوزین پر پڑ گئی اور وہ دل وجان سے اس پر فدا ہوگیا۔ سوزین اس کی نیت سے بے خبر اس سے ملتی رہی۔ اب وہ ایسے اوقات میں بھی آنے لگا تھا جب پادری گھر پر نہیں ہوتا۔ سوزین کسی خطرے سے بے پروا اس سے گفتگو کرتی رہتی۔ ریزیڈنٹ بھی بہت محتاط تھا۔ وہ غالباً سوزین کی جانب سے کسی پیش قدمی کا منتظر تھا۔ اس لیے صرف بیش قیمت تحائف تک محدود تھا جو وہ سوزین کے انکار کے باوجود پیش کرتا رہتا تھا۔

''آپ تنہائی سی گھبرا نہیں جاتیں؟'' ایک دن اس نے سوزین سے کہا۔

''میں کتابیں پڑھتی ہوں۔ میرا بیٹا میرے ساتھ ہے۔ پھر تنہائی کیسی؟'' سوزین نے جواب دیا۔

''آپ جیسی خوبصورت عورت کو اس کے سوا بھی تو کچھ اور چاہیے۔''

''میرا شوہر ہے جو ان دنوں باہر گیا ہوا ہے۔ وہ بس آنے ہی والا ہے۔''

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے' وہ کبھی نہ آئے؟''

''آپ کو یہ بات کم از کم مجھ سے نہیں کہنی چاہیے تھی۔''

''میں نے تو اس لیے کہا کہ آپ جیسی عمر کی خاتون کو انتظار زیب نہیں دیتا۔''

''مجھے کیا زیب دیتا ہے کیا نہیں' یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔''

وہ سمجھ رہی تھی کہ اتنے سخت جواب کے بعد ریذیڈنٹ اس کی طرف سے مایوس ہو جائے گا لیکن اس کا خیال غلط نکلا۔ اس کی نوازشات اسی طرح جاری رہیں۔ وہ اتنا بااثر تھا کہ سوزین اس کے ساتھ سختی سے پیش نہیں آسکتی تھی۔ اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے حکمت کی ضرورت تھی۔ اس نے آئزک کو خط لکھا جس میں ریزیڈنٹ کی تمام حرکتیں بیان کردیں۔ صاف لکھ دیا کہ ریذیڈنٹ کی طرف سے اسے خطرہ ہے' وہ فوراً چلا آئے۔

سوزین کو امید نہیں تھی کہ آئزک اتنا غیرت مند نکلے گا۔ خط لکھے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ جواب میں آئزک خود چلا آیا۔ اب ریزیڈنٹ اسے تنہائی کا طعنہ نہیں دے سکتا تھا۔ آئزک نے بھی محسوس کیا کہ اب وہ اکیلا نہیں کہ جہاں جی چاہے گھومتا پھرے۔ اسے جنیوا ہی میں رہ کر کام کرنا چاہیے۔ گھر کی رونقیں پھر لوٹ آئیں۔ سوزین اسے کتابیں پڑھ پڑھ کر سناتی رہتی اور وہ گھڑیوں کی سوئیاں قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا رہتا۔

سوزین ایک دن اچانک پریشان ہوگئی۔ وہ دوسرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ کہیں آئزک پھر نہ چلا جائے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اسے بتایا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کا شوہر اب پہلے والا آئزک نہیں رہا۔ اس نے خوش دلی سے یہ خبر سنی اور سوزین کو مبارک باد دی۔

''میں تو سمجھ رہی تھی آپ ناراض ہوں گے۔''

''ناراض تو میں پہلے بھی نہیں ہوا تھا۔''

''مجھے چھوڑ کر تو نہیں چلے جائیں گے؟''

''میں نے تمہیں بہت ستایا ہے۔ اب ایسا ارادہ نہیں۔''

سوزین اس کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ وہی آئزک ہے؟ پھر وہ خوشی سے جھومنے لگی۔ یہ بچہ کتنا مبارک ہے جو اپنے باپ کو راہِ راست پر لے آیا۔ میں بڑے اہتمام سے اس کا استقبال کروں گی۔

سوزین نے بڑے دن بعد گھر کا سکھ دیکھا تھا۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا کہ اس کا شوہر محض جھگڑالو نہیں ہے اور کبھی تھا بھی تو اب بہت بدل گیا ہے۔

گھر میں بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی۔ وہ وقت آ گیا تھا جس کا انتظار تھا۔ خاندان کی عورتیں سوزین کے ساتھ کمرے میں موجود تھیں۔ آئزک اور اس کا چھوٹا بھائی مردانہ کمرے میں بیٹھے کوئی خبر سننے کے منتظر تھے۔ یہ خبر جلد ہی آ بھی گئی۔ سوزین نے اس مرتبہ بھی بیٹے کو جنم دیا تھا۔ آئزک کی بہن یہ خبر لائی ضرور تھی لیکن سخت پریشان بھی تھی۔

''کیا بات ہے' تم پریشان کیوں ہو؟''

''بچہ بے حد کمزور پیدا ہوا ہے اور خود سوزین کی حالت بھی ٹھیک نہیں۔''

"ڈاکٹر اور نرس کیا کر رہے ہیں؟"

"وہ ان دونوں کی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

آئزک اس سے زیادہ کچھ اور سننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ اس کمرے کی طرف بھاگا جہاں سوزین خطروں سے لڑ رہی تھی۔ آئزک کمرے میں پہنچا تو بچہ اس کی بہن کے ہاتھوں میں تھا لیکن سوزین ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ پہلے بچے کی ولادت پر آئزک اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ دوسرا بچہ ہوا تو وہ آئزک کو چھوڑ کر چلی گئی۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس بچے کو منحوس سمجھا جاتا جس نے زمین پر آتے ہی اپنی ماں کی زندگی کو موت میں تبدیل کر دیا لیکن ہوا یہ کہ آئزک نے اسے سوزین کی نشانی سمجھ کر سینے سے لگالیا۔

"آج سے تم اس کی پرورش کرو گی" آئزک نے اپنی بہن سے کہا "یہ وہ مظلوم بچہ ہے جس نے اپنی ماں کو دیکھا تک نہیں۔ سوزین اسے میرے سپرد کر کے گئی ہے۔ اب میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہوں گا۔"

آئزک نے جو کہا تھا' وہ کر کے دکھا دیا۔ بڑا بیٹا گھر میں تھا لیکن اس نے کبھی آنکھ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کے برخلاف وہ چھوٹے بیٹے کو دیکھ دیکھ کر نہ تھکتا تھا۔ اس بیٹے کا نام اس نے ژاں ژاک روسو رکھا تھا لیکن صرف روسو کہہ کر پکارتا تھا۔ باپ کی اتنی توجہ دیکھ کر اس کی بہن بھی روسو کو آنکھوں کی پلکوں پر رکھ کر پال رہی تھی۔

سب کا خیال تھا کہ آئزک یا تو آوارہ گردی کے لیے کسی طرف نکل جائے گا یا دوسری شادی کر لے گا لیکن اس نے اس میں سے کوئی ایک بات بھی نہیں کی۔ وہ اپنے کام میں پہلے سے زیادہ مشغول ہو گیا۔ سوزین سے اسے اتنی محبت تھی کہ اس کے بعد دوسری شادی بھی نہیں کی۔ سوزین کی یاد تازہ رکھنے کے لیے خالی وقت میں اس کی چھوڑی ہوئی کتابیں پڑھنا اس کا محبوب مشغلہ ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی وہ ان کتابوں کو بلند آواز میں پڑھنے لگتا جس طرح سوزین اسے سنانے کے لیے پڑھا کرتی تھی۔ وہ اپنی دانست میں ان کتابوں کے مندرجات ننھے روسو کو سنایا کرتا تھا۔

جب روسو گھٹنے چلنے لگا تو چھٹی والے دن وہ بھی بکھری ہوئی کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس دن اس کا باپ ان کتابوں کی جھاڑ پونچھ میں مصروف ہو جایا کرتا تھا۔

"روسو! یہ تمہاری ماں کی کتابیں ہیں۔ وہ ان سے بڑا پیار کیا کرتی تھی۔ انہیں پڑھتی بھی تھی اور سنبھال کر بھی

سوانحی خاکہ

اصل نام......ژاں ژاک

مشہور نام.........روسو

والد...........آئزک روسو

پیدائش.........جنیوا

تاریخ ولادت.........28 جون 1712ء

تاریخ وفات.........2 جولائی 1778ء

☆☆☆

ماخذ: اس کہانی میں بیان ہونے والے تمام واقعات جناب قاضی جاوید کی کتاب "روسو" سے ماخوذ ہیں۔

رکھتی تھی۔ میں اس دن کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں جب تم انہیں پڑھنے کے لائق ہو جاؤ گے" وہ ننھے روسو کو مخاطب کر کے کہا کرتا تھا۔

یہ دن وقت سے پہلے ہی آ گیا۔ روسو کی پھوپی کی بے پناہ توجہ نے صرف چھ سال کی عمر میں روسو کو اس قابل بنا دیا کہ وہ ان کتابوں کو پڑھنے لگا جو زیادہ تر داستانیں اور تاریخیں تھیں۔ آئزک کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ اب وہ گھڑیوں کی مرمت میں مصروف ہو جاتا اور روسو اسے کتاب پڑھ کر سنانے لگتا' جیسے کبھی سوزین سنایا کرتی تھی۔

آئزک کا بڑا بیٹا گھر والوں کی عدم توجہی کا شکار تھا۔ اس نے گھڑیوں کا کام سیکھ لیا تھا لیکن خاندان کے رویے سے مطمئن نہیں تھا۔ بالآخر ایک روز گھر سے بھاگ گیا۔ آئزک نے پروا بھی نہیں کی جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی بلکہ ایک طرح وہ خوش ہی ہوا کہ اب اس کے اور روسو کے درمیان کوئی اور موجود نہیں۔

روسو آٹھ سال کا ہو چکا تھا لیکن ابھی تک اس کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز نہیں ہوا تھا البتہ اپنے طور پر تمام دستیاب ناول پڑھ لیے تھے۔ وہ دن بھر کتابوں کی دنیا میں کھویا رہتا یا پھر اپنی پھوپی کی سریلی آواز میں لوک گیت سنا کرتا۔

اس کا بچپن کتابوں اور موسیقی کے جھولے میں جھول رہا تھا کہ ایک فرانسیسی افسر سے آئزک کا جھگڑا ہو گیا۔ آئزک صدا کا جھگڑالو تھا۔ افسر بھی بااثر تھا۔ نوبت مارکٹائی تک آ گئی۔ آئزک ڈر گیا کہ اب کئی سال جیل میں گزارنے پڑیں گے۔ وہ بھاگ نکلا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لوزین چلا گیا اور وہاں اس نے ایک عورت سے شادی کر لی۔ سوزین کی موت کا صدمہ اور ننھے روسو کی محبت کوئی بھی اسے نہ روک سکا۔

روسو اب بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ پھوپی کی بے پناہ محبت اور خود اس کی لا ابالی طبیعت اسے زندہ رکھے ہوئے تھی۔ کھیل کود سے اسے رغبت نہیں تھی۔ دل بہلانے کو پھوپی کے گنگنائے ہوئے لوک گیتوں کو دھنیں بدل بدل کر گاتا رہتا تھا۔ اس کے چچا نے بہت چاہا کہ اسے بھی گھڑی سازی کے خاندانی کام کی طرف لے آئے لیکن اسے تو کتابوں کے سوا کسی چیز سے سروکار ہی نہیں تھا۔ چچا اور پھوپی کے درمیان مشورے ہونے لگے کہ سوزین کی اس نشانی کو کس کام پر لگایا جائے۔ بالآخر طے ہوا کہ اسے تعلیم دلائی جائے۔ اس کے چچا نے اسے ایک نواحی گاؤں کے مدرسے میں داخل کرادیا۔

چچا اور پھوپی کو اس سے بڑی امیدیں تھیں۔ اسے کتابوں سے شغف تھا۔ خیال یہی تھا کہ وہ مدرسے کے پادریوں کی صحبت میں رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے گا۔ اس کا اپنے بارے میں شاید خود بھی یہی خیال ہو۔

مدرسے میں داخل ہوتے ہی اسے لاطینی زبان سکھائی جانے لگی جو یورپ کی اہم زبان سمجھی جاتی تھی۔ اس زبان پر عبور حاصل کرنے کے بعد طالب علم پر علم کے دروازے کھل جاتے تھے۔ چند ماہ بعد ہی اس کے اساتذہ پر یہ راز کھل گیا کہ ان کا سابقہ ایک نہایت کند ذہن طالب علم سے پڑ گیا ہے۔ وہ اس زبان میں معمولی شد بد کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں کر سکا تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ وہ عام زندگی میں جتنا ذہین نظر آتا تھا' تعلیم کے معاملے میں اتنا ہی کند ذہن تھا۔ اس کے نگراں پادری نے اس کیفیت کو اس کی عدم توجہی سمجھا اور اسے راہِ راست پر لانے کے لیے مار پیٹ سے کام لینا شروع کر دیا۔ پادریوں کے اس رویے سے روسو کے ذہن میں یہ خیال پختہ ہوگیا کہ علم انسان کو بے رحم اور ناانصاف بنا دیتا ہے ورنہ یہ پادری اس کے ساتھ یہ سلوک نہ کرتے۔ وہ جن کا دل کی گہرائیوں سے احترام کرتا تھا' وہ اس کے ساتھ بے رحمی کا سلوک کررہے تھے۔ یہ حالات اس کے ذہن سے چپک کررہ گئے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ علم انسانی کردار کو ضعف پہنچاتا ہے۔ اب وہ حصولِ علم سے واقعی بھاگنے لگا۔ اس کے اساتذہ اسے پڑھا رہے ہوتے اور وہ دور کسی دنیا میں ڈوبا ہوا ہوتا۔ اساتذہ اس کی طرف سے مایوس ہوگئے اور بالآخر اسے مدرسہ چھوڑنا پڑا۔

مدرسے کے ان چند دنوں نے اس کی نفسیات کو ایک بڑے انقلاب سے دوچار کردیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ بے انصافی اور بے رحمی زندگی کا چلن ہے۔ اعلیٰ اقدار پر اس کا ایمان متزلزل ہوگیا اور اس کا سبب اس نے علم کو ٹھہرادیا۔

اب وہ بالکل فارغ تھا۔ اس کے مربیوں کے سامنے اب یہ مسئلہ درپیش تھا کہ اس کے لیے کس پیشے کا انتخاب کیا جائے۔ خاندانی پیشہ اس کے لیے مناسب ہوسکتا تھا لیکن اس کی طبیعت اس طرف مائل نہیں تھی۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا اس لیے پھوپی کی خواہش تھی کہ اس کا بھتیجا پادری بن جائے۔ خود روسو کو بھی پادری بننا اچھا لگتا تھا لیکن چچا کا خیال تھا کہ اسے وکیل بنایا جائے۔ گھر میں بحث کے دفتر کھل گئے۔ تینوں پھوپیاں ایک طرف تھیں اور چچا ایک طرف۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ روسو کی رائے بھی لی جائے۔

''میں تو پادری بننا چاہتا ہوں'' روسو نے اپنا فیصلہ دیا۔

''تم پادری کیوں بننا چاہتے ہو'' چچا نے پوچھا۔

''مجھے تبلیغ کرنا اچھا لگتا ہے۔''

''بس یہی یا اور کچھ؟''

''میں پادری اس لیے بھی بننا چاہتا ہوں کہ جس کو چاہوں سزا دوں۔ کوئی مجھ سے پوچھنا چاہے بھی تو نہ پوچھ سکے۔''

''یہ کام تو تم وکیل بن کر بھی کر سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے تو میں وکیل بن جاتا ہوں'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔

چچا نے اپنی دانست میں اس کی رضامندی لے لی تھی۔ انہوں نے کام سیکھنے کے لیے اسے ایک وکیل کے دفتر میں بھیج دیا۔ وہ وہاں چلا تو گیا لیکن ایک تو وکیل کی صورت اسے پسند نہیں آئی۔ دوسرے وہ وہاں بیٹھے بیٹھے اکتا گیا۔ وہ شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ جاتے ہی کوئی مقدمہ اس کے سپرد کردیا جائے گا۔ جب چند دنوں تک وکیل اس سے مختلف کتابیں شیلف سے نکلواتا اور رکھواتا رہا تو وہ اکتا گیا۔ وکیل نے بھی اسے غبی اور کند ذہن قرار دے کر دفتر سے نکال دیا۔ دراصل وہ وکیل کو پریشان کرنے کے لیے شیلف سے غلط کتابیں نکال لاتا تھا۔ وکیل کا دفتر اسکول کے ہیڈ ماسٹر کا کمرا بن گیا تھا۔ ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔

جب وہ مدرسے کی طرح وکیل کے دفتر سے بھی نکال دیا گیا تو اس کے چچا کو یقین آگیا کہ اس کا ناکارہ بھتیجا پڑھنے لکھنے کا کوئی کام کر ہی نہیں سکتا۔ اس مرتبہ انہوں نے اسے کان سے پکڑا اور ایک نقاش کے پاس نقاشی کا کام سیکھنے کے لیے چھوڑ آئے۔

''کیوں میاں' بیل بوٹوں سے کوئی دلچسپی ہے یا یونہی منہ اٹھا کر چلے آئے۔''

''میں ڈرائنگ بڑی اچھی کرتا ہوں۔''

''اچھا جی۔ تو تم ہمیں سکھانے آئے ہو۔ بڑی اچھی ڈرائنگ کے بچے، پنسل چلانا اور بات ہے ہتھوڑی چلانا دوسری۔''

''یہی سیکھنے تو آیا ہوں۔''

''سیکھو گے تو اس وقت جب استاد کی خدمت کرو گے۔ چل پاؤں دبا میرے۔''

وہ اس نقاش کے پاؤں دبانے بیٹھ گیا لیکن اسے یہ معلوم ہوگیا کہ نقاش کس فطرت کا آدمی ہے۔ بے رحم بھی اور ناانصاف بھی اس کا جی چاہا اسی وقت اٹھ کر بھاگ جائے لیکن پھر اس نے سوچا کہ اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ اسے کہیں اور کسی اور کام پر بٹھا دیا جائے گا۔ دنیا میں ہر طرف یہی ہو رہا ہے۔ اسے بھی ایسا ہی بننا پڑے گا۔ بے رحم اور ناانصاف۔ اس نے نقاش سے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے پہلے مرحلے پر جھوٹ کو اپنا ہتھیار بنالیا۔ اس سے کوئی کام بگڑ جاتا تو فوراً مکر جاتا کہ اس نے تو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

''پھر کیا تیرا باپ اسے بگاڑ گیا۔'' نقاش جھنجلا کر کہتا۔

''میں نے تو اپنے باپ کو برسوں سے نہیں دیکھا۔ وہ یہاں کیوں آنے لگا تھا۔'' روسو جواب دیتا۔

اس کی ان حرکتوں سے نقاش تنگ آچکا تھا۔ گالیاں بک بک کر اپنا غصہ اتارتا رہتا تھا۔ روسو بھی ایسا ڈھیٹ ہو چکا تھا کہ اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تھا، بلکہ نقاش کی جھنجلاہٹ کو دیکھ کر اسے یہ تشفی ہوتی تھی کی وہ دوسروں کی طرح بے رحمی کا مظاہرہ کررہا ہے۔ ایک روز اس کے پاس پیسے بالکل ختم ہوچکے تھے۔ دوستوں نے سیر و تفریح کا پروگرام بنالیا تھا۔ اس نے کارخانے سے نقاشی کا ایک قیمتی اوزار اٹھایا اور بازار میں جاکر بیچ آیا۔ چھٹی کے بعد وہ دوستوں کے ساتھ شہر سے باہر نکل گیا۔ چند روز بعد نقاش کو اس اوزار کی ضرورت پڑی۔ اس نے روسو سے پوچھا مگر اس نے صاف انکار کردیا۔ اس واقعہ کے بعد ایک اچھا ذریعہ اس کے ہاتھ لگ گیا۔ جب پیسوں کی ضرورت ہوتی وہ کارخانے سے کوئی نہ کوئی چیز اٹھا کر بیچ آتا۔ چوری کی یہ لت ایسی پڑی کہ کارخانہ تیزی سے خالی ہونے لگا۔ ایک روز بھاری رقم اس کے ہاتھ لگی۔ وہ دوستوں کے ساتھ شہر سے باہر نکل گیا۔ رات ہوگئی تو اسے خیال آیا کہ شہر کے دروازے بند ہوجائیں گے وہ تیزی کے ساتھ شہر کی طرف چل دیا لیکن دروازے کسی کنجوس کی مٹھی کی طرح بند ہوچکے تھے۔ وہ شہر سے باہر رک کر مٹھی کھلنے کا انتظار بھی کرسکتا تھا لیکن اس کی سرکشی نے اسے کوئی اور ہی راستہ دکھا دیا۔ جس شہر کے دروازے مجھ پر بند ہوجائیں اس شہر میں رہنے کا فائدہ کیا۔

بیرون ملک مقیم قارئین

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ — ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ — ماہنامہ سرگزشت

کے

سالانہ خریدار

بن کر بذریعہ رجسٹرڈ ائیر میل

اپنا پسندیدہ پرچا گھر بیٹھے حاصل کریں

ایشیا، یورپ اور افریقا کے لئے زرِ سالانہ

2000 روپے

امریکا، آسٹریلیا، کینیڈا اور نیوزی لینڈ کے لئے زرِ سالانہ

2500 روپے

اپنے ڈرافٹ اور منی آرڈر ادارے کے نام، ذیل میں درج پتے پر ارسال کریں۔ یہ کراچی میں قابل ادائی ہونا ضروری ہیں۔ بیرون شہر/ ملک ادائی کے لئے بنک کمیشن کے دس ڈالر کے مساوی رقم کا اضافہ کرلیں۔

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C PHASE II EXTENSION,
D.H.A., MAIN KORANGI ROAD,
KARACHI 75500
PHONES: (92) (21) 5802552,
5804200 FAX: 5802551
E-MAIL: jasoosi@attglobal.net

اس نے شہر کی مخالف سمت چلنا شروع کر دیا اور سات آٹھ میل کا فاصلہ طے کر کے ایک مقام "سوائے" پہنچ گیا۔ اس شہر میں نہ تو کوئی اس کا شناسا تھا اور نہ ہی وہ راستوں سے واقف تھا۔ یہ فکر بھی تھی کہ وہ رہے گا کہاں اور کھائے گا کیا۔ وہ اس دھن میں چلا جا رہا تھا کہ اسے کیتھولک پادریوں کی ایک خانقاہ دکھائی دی۔ وہ خود پروٹسٹنٹ فرقے سے تعلق رکھتا تھا لیکن پیٹ میں لگی آگ نے اسے کچھ سوچنے کا موقع نہ دیا۔

"نوجوان، کہاں سے چلے آ رہے ہو؟"

"جنیوا سے۔"

"یقیناً پروٹسٹنٹ فرقے سے ہو گے کیونکہ جنیوا ان کی پناہ گاہ ہے۔"

"فی الحال تو میں بھوکوں کے فرقے سے ہوں۔ سخت بھوک لگی ہے۔"

"کھانے کو بھی مل جائے گا، پہلے اپنا مذہب بتاؤ۔"

"میرے والدین پروٹسٹنٹ فرقے سے تھے۔"

"اور تم؟"

"سچائی کی تلاش ہی میں تو گھر سے نکلا ہوں۔"

"تو پھر سچائی یہ ہے کہ تم کیتھولک ہو جاؤ۔"

"آپ کے فرقے میں ایسی کیا سچائی ہے۔"

"پہلے تم اچھی طرح پیٹ بھر لو پھر بات ہو گی۔"

ان خوش عقیدہ پادریوں نے نہ صرف لذیذ کھانے اس کے سامنے چن دیئے بلکہ سرخ شراب سے بھی اس کی مدارات کی۔ بھوکا ردسو شراب سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور سوچتا جا رہا تھا کہ ان پادریوں کے جذبات سے کھیل کر وہ زندگی کی بہت سی آسائشوں سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ اگر وہ ان نعمتوں کو حاصل کرنے کے لیے اپنا فرقہ بدل لے تو کیا حرج ہے۔

جب وہ سیر ہو کر کھانا کھا چکا تو پادریوں نے اپنے فرقے کے حق میں دلائل دینے شروع کر دیے۔ وہ اس نوجوان کا عقیدہ بدلنے کے لیے پرزور دلائل پیش کر رہے تھے اور ردسو دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ درمیان میں کوئی سوال بھی پوچھ لیتا تھا کہ اس کی دلچسپی ظاہر ہو۔

"میرے والدین تو واقعی بڑے بے وقوف تھے کہ انہوں نے کیتھولک مذہب چھوڑ کر پروٹسٹنٹ فرقہ اختیار کر لیا۔ مجھے تو آپ کے مذہب میں زیادہ سچائی نظر آتی ہے۔"

"تو تم اپنا آبائی مذہب چھوڑنے پر تیار ہو؟"

"میں دل و جان سے آپ کا مذہب قبول کرتا ہوں۔"

"تم ہمارے فرقے کی بہت سی باتیں نہیں جانتے ہو گے۔"

"ظاہر ہے۔ مجھے آج تک کسی نے کچھ بتایا ہی نہیں۔"

"تمہاری تربیت کی ضرورت ہے۔"

"آپ کے ساتھ رہوں گا تو تربیت خود بخود ہو جائے گی۔"

"نہیں۔ اس مقصد کے لیے تمہیں مادام دے وارین کے پاس جانا ہوگا۔"

"یہ مادام کون ہیں؟"

"یہ ایک سوئس خاتون ہیں جن کے ذمے کیتھولک فرقے میں داخل ہونے والے نوجوانوں کی تربیت کا کام رکھا گیا ہے۔"

دوسرے دن اسے "سوائے" کے بشپ کی جانب سے تعارفی خط مل گیا جسے لے کر اسے مادام کے پاس جانا تھا۔ اس نے اس خاتون کے بارے میں قیاس کے کئی گھوڑے دوڑائے، تصور کے کئی مسافر اس کے ذہن میں چلے پھرے، اور بالآخر وہ اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔ مادام دے وارین پہلی ہی نظر میں اسے بالکل اپنی طرح معلوم ہوئی۔ چند دن اس کے ساتھ گزارنے کے بعد اسے اپنے اندازوں پر ناز بھی ہونے لگا۔ مادام بھی اس کی طرح اپنے فرقے کو چھوڑ کر کیتھولک بنی تھی۔ مذہبی ہونے کے باوجود وہ ردسو کی طرح آزاد خیال بھی تھی۔ اس کی طرح برے اور بھلے دونوں خیالات کا مجموعہ تھی۔ نوجوانوں میں دلچسپی لیتی تھی۔ تجارتی سٹے بازی کا شوق بھی تھا۔ کیمیا بنانے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اس کی آزاد خیالی نے ردسو کا دل موہ لیا۔ وہ مال دار عورت تھی۔ ردسو پر مال بھی خرچ کر سکتی تھی۔ مادام کا حال بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ اس نے بھی ردسو میں بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔ وہ اسے اپنے مطلب کا نوجوان نظر آیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس پر فدا ہو گئی تھی لیکن اپنے اصولوں سے مجبور تھی۔ اس کے فرائض میں شامل تھا کہ وہ نئے آنے والے کو چند روزہ تربیت کے بعد "تورین" بھیج دے جہاں بدعتیوں کو راہِ راست پر لانے کی درس گاہ تھی۔ مادام نے اسے کچھ اس انداز سے رخصت کیا کہ وہ اس سے دوبارہ ملنے کی خواہش لے کر تورین پہنچ گیا۔ اس نے پروٹسٹنٹ فرقے سے کیتھولک فرقے میں قدم رکھا تھا۔ اس لیے اسے یہ بتانا بڑا ضروری تھا کہ اس کے آبائی فرقے میں کون کون سی بدعتیں رائج ہیں۔ وہ ان بدعتوں کو سن رہا تھا اور اسے اپنی تینوں پھوپھیاں یاد آ رہی تھیں جو پروٹسٹنٹ فرقے سے تھیں۔ دن رات عبادت کرتی تھیں۔ تو کیا وہ بھی بدعتی ہیں؟ کیا وہ دوزخ میں جائیں گی؟ اور اس کی ماں؟ اس کے لہو نے جوش مارا۔ اس نے طرح طرح کے سوال اٹھانے شروع

کر دیے۔ کوئی جواب اسے مطمئن نہ کرسکا۔ پادری حضرات کے نزدیک اس قسم کے اختلافات کی گنجائش نہیں تھی۔ انہوں نے روسو کے ہاتھ پر بیس فرانک رکھے اور درس گاہ سے نکال باہر کیا۔ یہ بیس فرانک وہ تھے جو اس کے سابقہ مذہب سے حلفی انکار کی تقریب میں لوگوں نے اسے دیے تھے۔

اس کے ہاتھ میں بیس فرانک کی رقم دبی ہوئی تھی اور وہ خانقاہ کے دروازے پر بے یارومددگار کھڑا ہوا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اپنے غصے پر اتنا قابو کب تھا کہ اپنے مذہبی جذبات کو چھپالیتا۔ بہرحال اب کیا ہوسکتا تھا۔ وہ سر جھکا کر قصبے کی ایک سرائے کی طرف چل دیا۔

''مجھے یہاں رہنے کے لیے جگہ مل جائے گی؟''

''کیوں نہیں۔ یہ سرائے ہے بس شرط یہ ہے کہ جیب میں پیسے ہوں۔''

''پیسے تو میرے پاس ہیں۔''

''کتنے دن ٹھہرو گے؟''

''جتنے دن پیسے چلیں گے۔''

''میرا مشورہ ہے یہاں سے جلد ہی چلے جاؤ۔''

''وہ کیوں؟''

''تم پروٹسٹنٹ ہو اس لیے۔''

''کیا میں انسان نہیں ہوں۔''

''یہاں انسان وہ ہے جو کیتھولک ہے۔ آگے تم خود عقلمند ہو۔''

وہ سرائے کے ایک کمرے میں بچھے بستر پر سونے کے لیے لیٹا تو خیالوں نے اس کے اردگرد ہجوم لگا دیا۔ وہ گزرتے ہوئے واقعات پر غور کررہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اسے آئندہ کیا کرنا ہے۔ اس کی جیب میں رکھی رقم اسے سہارا دے رہی تھی۔ وہ کئی دن یہاں رہ سکتا تھا اور سوچ سکتا تھا۔

وہ اگلے چند دنوں تک سرائے سے باہر نہ نکلا۔ سرائے کا مالک بجا طور پر یہ سوچ رہا تھا کہ نوجوان خوف کے مارے باہر نہیں آرہا ہے۔

اسے اس نوجوان سے ہمدردی بھی تھی۔ ایک روز وہ اس کے کمرے میں آیا۔ روسو اس وقت بھی گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ کون جانے کیا سوچ رہا تھا۔

''نوجوان! میں تمہاری تنہائی میں مخل تو نہیں ہوا؟''

''مخل تو ہوئے ہو مگر پھر بھی۔ کہو کیا کہنا ہے۔''

''کیا سوچ رہے تھے؟''

''سوچ رہا تھا' اب مجھے کیا کرنا ہے۔''

''کچھ سوچا؟''

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''نوکری کرو گے؟''

''میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔''

''تیار ہو جاؤ اور میرے ساتھ چلو۔''

''کہاں۔''

''ایک جاگیردار خاتون کو ملازم کی ضرورت ہے۔ مضبوط ہاتھوں میں رہو گے تو تمہیں کوئی خطرہ بھی نہیں ہوگا۔''

روسو نے بھی یہی بہتر سمجھا کہ اس موقع کو ضائع نہ کرے۔ وہ سرائے کے مالک کے ہمراہ جاگیردارنی کی خدمت میں پہنچ گیا۔ یہ ایک بوڑھی خاتون تھی اور ان دنوں بیمار بھی تھی۔ چند ضروری سوالات کا جواب دینے کے بعد اسے خدمت گار کے طور پر نوکری مل گئی۔ اسے دوسرے ملازموں کی طرح ایک وردی دے دی گئی۔ اس وردی کو پہن کر اس نے اپنا سراپا آئینے میں دیکھا تو لطف اندوز ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ زندگی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ زندگی یہی تو ہے ہر قدم ایک نیا روپ۔ اس نے اس روپ کو قبول کیا اور اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔

وہ چند دن کی دھوپ اس گھر میں کاٹ چکا تو اس کی نظر اپنی ساتھی ملازمہ میرین پر پڑی۔ اس نے پہلی مرتبہ کسی کو اتنے غور سے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے وہ مادام سے مل چکا تھا لیکن وہ اس سے بارہ سال بڑی تھی جبکہ میرین اس کی ہم عمر تھی۔ ہم عمری کی اس کشش نے میرین کو بھی اس سے دور نہیں رہنے دیا۔ ایک ہی گھر میں رہنا تھا۔ ملازموں کے کمرے الگ الگ تھے لیکن دن میں کئی مرتبہ آمنا سامنا ہوتا تھا۔ میرین کو یہ اجنبی نوجوان اتنا پسند آیا کہ دل دے بیٹھی۔ وہ دونوں دوسرے ملازموں سے آنکھ بچا کر چھپ چھپ کر ملتے رہے۔

''کسی دن مادام سے کہوں گی کہ وہ ہم دونوں کو ایک کر دے۔ اب میں تم سے دور نہیں رہ سکتی۔''

''کیوں وقت ضائع کررہی ہو۔ جو بات کرنی ہے وہ جلدی سے کرلونا۔''

''کیا بات کررہے ہو۔ دیکھ نہیں رہے ہو وہ کتنی بیمار ہیں۔ ان کی طبیعت ٹھیک ہوجائے پھر یہ بات بھی ہوجائے گی۔''

یہ باتیں وہ روز ہی کرتے تھے۔ مادام کی طبیعت روز بروز خراب ہوجاتی جارہی تھی۔ ایک رات اس محل میں موت کے فرشتے اترے اور جاگیردار خاتون ہمیشہ کے لیے سوگئی۔

''میرین اب کیا ہوگا۔''

''ہونا کیا ہے۔ اب تو اجازت کی ضرورت بھی نہیں

رہی۔ مادام کا سوگ ختم ہوتے ہی میں تمہاری ہو جاؤں گی۔'' میرین نے کہا اور اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

مادام کے انتقال کے بعد اس کے گھریلو ساز و سامان کی فہرست تیار کی جا رہی تھی۔ فہرست بناتے ہوئے معلوم ہوا کہ مرحومہ کا گلابی ربن غائب ہے۔ نوکروں سے پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ ہر ملازم انکار کر رہا تھا۔ ردسو سے پوچھا۔ اس نے بھی انکار کر دیا۔ جب سب انکار کر چکے تو طے ہوا کہ تلاشی لی جائے گی۔ ردسو بھی دوسرے بے قصوروں کی طرح مطمئن کھڑا تھا۔ اس کی تلاشی لی گئی تو ربن اس کے پاس سے برآمد ہو گیا۔

''اچھا تو چور تم ہو۔ ربن تم نے چرایا ہے۔''

''میں نے نہیں چرایا۔''

''پھر یہ تمہارے پاس کیسے آ گیا۔''

''یہ ربن مجھے میرین نے دیا تھا۔'' ردسو نے ڈھٹائی سے کہا ''میں سمجھا تھا یہ ربن اس کا ہے مجھے کیا خبر تھی کہ اس نے چرایا ہے۔''

میرین بے قصور تھی۔ ردسو کی چوری کی عادت ابھی گئی نہیں تھی۔ یہ ربن خود اس نے چرایا تھا اور الزام معصوم دوشیزہ پر رکھ دیا۔ اور اس کے باوجود کہ وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ یہ بے رحمی کی شاندار مثال تھی۔ اس بے رحمی کی، جس پر اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہی زندگی ہے۔

مادام کے انتقال کے بعد ملازموں کو فارغ کر دیا گیا تھا۔ وہ میرین کو رسوائی کا داغ دے کر وہاں سے نکل آیا۔ ایک مرتبہ پھر سرائے اس کا ٹھکانہ بن گئی۔ اب وہ اس قصبے سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا لہٰذا نئی ملازمت کی تلاش بھی کرتا رہا۔ خوش قسمتی سے ایک اور جاگیردار کے گھر اسے ملازمت مل گئی۔

ردسو نے اپنی ذہانت سے اس گھرانے کے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا لی۔ اس گھرانے کے بہت سے لوگ یہ محسوس کرنے لگے کہ یہ شخص عام ملازموں سے بہت مختلف ہے۔ اس خاندان کے ایک شخص نے اسے اپنا سیکریٹری بنا لیا اور اس سے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ اسے اعلیٰ تعلیم بھی دلوائیں گے۔

یہ سلسلہ اگر چلتا رہتا تو ممکن ہے وہ کئی زبانوں پر عبور حاصل کر لیتا۔ اس کی شخصیت میں نکھار آ جاتا لیکن اپنی جھگڑالو طبیعت میں وہ بھی اپنے باپ پر گیا تھا۔ اپنے محسنوں ہی سے الجھ پڑا۔ سولار خاندان نے اسے نکال باہر کیا۔ اس دوران قصبے کا ایک بدمعاش اس کا دوست بن گیا تھا۔ ملازمت سے ہاتھ دھوتے ہی وہ اس بدمعاش بیلکر کے پاس پہنچ گیا۔

''یار، سولار خاندان بڑا ہی بے مروت نکلا۔ اتنے دن ملازمت کی اور ملازمت سے یوں نکال دیا جیسے دودھ سے مکھی۔''

''تم بھی اتنے سیدھے نہیں ہو۔ کچھ نہ کچھ تم نے بھی کیا ہوگا۔''

''یار، جب جھگڑا ہوتا ہے تو گھونسا مار دینا عام سی بات ہے۔''

''تم کہو تو ایک آدھ کا منہ میں بھی جا کر توڑ آؤں کہ میرے یار کو نوکری سے کیوں نکالا۔''

''کیا فائدہ۔ اب کہیں اور جا کر قسمت آزماتے ہیں۔''

''کہاں جاؤ گے۔''

''آؤ، تمہیں جنیوا لے کر چلتا ہوں۔ گھر سے نکلے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں۔''

وہ اس بدمعاش بیلکر کے ساتھ جنیوا کی طرف پیدل چل پڑا۔ یہ لگ بھگ تین سو میل کا فاصلہ تھا لیکن دونوں نے ہمت کی اور فاصلہ کم کرتے رہے۔ جب وہ اماسے کے قریب پہنچے تو اسے مادام دے وارین کا خیال آ گیا۔ ردسو نے ارادہ بدل دیا۔ اس نے سوچا جنیوا کے بجائے مادام کے سائے میں پناہ لے۔ اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ لفنگے بیلکر کو ساتھ لے جانا ٹھیک نہیں رہے گا۔ کاش! وہ اسے ساتھ نہ لاتا۔ وہ بیلکر سے پیچھا چھڑانے کی ترکیب سوچنے لگا۔ جب وہ اماسے کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے تو ردسو ایک جگہ بیٹھ گیا۔

''یار، کچھ دیر آرام کر لیں۔ اب تو بہت تھک گئے۔''

''سرائے میں کیا ٹھہرنا، یہیں درخت کے نیچے سو جاتے ہیں۔''

بیلکر اس کی باتوں میں آ گیا۔ بیلکر اس کے ارادے سے بے خبر تھا لہٰذا لیٹتے ہی سو گیا۔ ردسو اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے جاگ رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ بیلکر سو گیا ہے۔ ردسو اٹھا اور اماسے کی طرف چل دیا۔ بیلکر اگر اٹھا بھی ہوگا تو اس کی تلاش میں جنیوا کی طرف چل دیا ہوگا۔ یا پھر واپس اپنے قصبے کی طرف چل پڑا ہوگا۔

شہر میں پہنچ کر مادام دے وارین کو تلاش کرنا کون سا مشکل تھا۔ کچھ ہی دیر میں بعد وہ مادام کے مکان کے سامنے تھا۔ ردسو کو شرمندگی ضرور تھی کہ وہ مادام کی توقعات پر پورا نہ اتر سکا لیکن اس کے دل میں مادام کا نقش ایسا جاگزیں ہو چکا تھا کہ وہ اس سے ملنے کے لیے جنیوا کا سفر ملتوی کر سکتا تھا۔

وہ ماں کی محبت سے محروم رہا تھا اور مادام کی شخصیت میں اسے ماں کی جھلک نظر آتی تھی مگر یہ بھی عجیب بات تھی کہ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ مادام بالکل ایک بیوی کی طرح اس کی خدمت

کرے بلکہ وہ اس کی بیوی ہی ہو۔ وہ ایسے ہی متضاد جذبات کا انسان تھا۔ زندگی کی اعلیٰ قدریں کبھی اس میں پنپ ہی نہیں سکی تھیں۔ شاید مادام اس کی اس کیفیت سے آگاہ ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس مرتبہ وہ اس سے ملی تو اس کی شخصیت کا یہ پہلو واضح طور پر مادام کے سامنے تھا۔

"تمہیں مذہبی تربیت کی سخت ضرورت ہے۔ یہ تربیت تمہارے مستقبل کا سہارا بھی بن سکتی ہے۔ تم دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کسی قصبے یا گاؤں میں پادری مقرر ہو سکتے ہو۔"

اس نے روسو کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک مذہبی تربیت گاہ میں داخل کرا دیا۔ مادام کا یہ منصوبہ نہایت مناسب تھا لیکن روسو کی آوارہ گردی اسے کسی راہ چلنے ہی نہیں دیتی تھی۔ وہ مادام کی خواہش کو ٹھکرا نہیں سکتا تھا لیکن لاطینی زبان پر عبور حاصل کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی اور یہ زبان سیکھے بغیر دینی علوم حاصل نہیں کیے جا سکتے تھے۔ وہ کچھ دن درس گاہ کی دیواروں سے سر پھوڑتا رہا اور پھر اس تربیت گاہ کو چھوڑ دیا۔

درس گاہ سے نکلنے کے بعد وہ مادام کی طرف لوٹ سکتا تھا لیکن کس منہ سے جاتا۔ اس نے مادام کی توقعات کو ایک مرتبہ پھر ٹھیس لگا دی تھی۔ وہ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے مادام سے دور ہو گیا۔ وہ کچھ دنوں آوارہ گرد بنا گھومتا رہا۔ پھر اس کی ملاقات ایک موسیقار سے ہو گئی۔ اسے نہ جانے کیوں یہ اعتبار تھا کہ وہ ایک اچھا موسیقار بن سکتا ہے۔ اس کی ایک پھوپی بچپن میں اسے لوک گیت سنایا کرتی تھیں۔ ان کی آواز بہت سریلی تھی ان گیتوں کو سن سن کر اسے بھی ان گیتوں سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ اپنی تنہائیوں میں گنگناتا بھی رہتا تھا۔ اس موسیقار سے ملاقات ہوئی تو روسو کا یہ شوق ابھر کر سامنے آ گیا۔ اس نے سوچا کہ موسیقی کی تعلیم میں معمولی سی بھی دسترس حاصل ہو گئی تو چھوٹی موٹی محفلوں میں اپنے فن کا جادو جگا کر وہ اچھا خاصا کما لیا کرے گا۔ یہ موسیقار ایک غریب آدمی تھا۔ مختلف چوراہوں اور بازاروں میں مذہبی گیت گا کر اپنا گزارہ کیا کرتا تھا۔ روسو سے مل کر بہت خوش ہوا۔ روسو کو اپنے بڑھاپے کا سہارا سمجھا اور بڑے تپاک سے ملا۔ روسو نے اس سے موسیقی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ جب وہ موسیقار گلیوں میں گاتا بجاتا نکلتا تو روسو بھی اس کے ساتھ ہوتا۔

روسو کا مسئلہ ہی یہ تھا کہ وہ ایک راستے پر زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا۔ ایک سال تک راگ رنگ کی محفلیں جمانے کے بعد روسو کا دل بھر گیا۔ اب وہ اس موسیقار سے پیچھا چھڑانے کی ترکیبیں سوچنے لگا تھا۔ ایک دن وہ بازار سے گزر رہا تھا۔ وہ موسیقار بھی اس کے ساتھ تھا۔ موسیقار پر مرگی کا دورہ پڑا اور وہ زمین پر گر پڑا۔ روسو کے دل میں بے رحمی کے جذبے نے جگہ بنائی۔ اس نے اپنے محسن کو زمین پر گرا ہوا چھوڑا اور وہاں سے کھسک گیا۔ ایک ٹھکانہ اب بھی اس کا منتظر تھا۔ وہ مادام کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ تو پیرس جا چکی ہیں۔ اب وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح سڑک پر کھڑا تھا۔ موسیقار کے پاس بھی جانا نہیں چاہتا تھا' مادام بھی جا چکی تھی۔ اس نے سوئٹزر لینڈ میں آوارہ گردی شروع کر دی۔ اسے زیادہ سے زیادہ ایک فیشن ایبل فقیر کہا جا سکتا تھا جس کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ کوئی ہنر ہاتھ میں نہیں تھا تعلیم بھی ادھوری تھی۔ جہاں جگہ مل جاتی سو جاتا جو مل جاتا کھا لیتا۔ وہ جلد ہی اپنی اس حالت سے اکتا گیا۔ اور کچھ دن بعد وہ لوزین پہنچ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے اپنا نام بدل لیا اور فرانسیسی موسیقار کا روپ دھار کر شہر کے اعلیٰ طبقوں میں آنا جانا شروع کر دیا۔ موسیقی میں معمولی شد بد تو حاصل ہو ہی چکی تھی۔ ہر شخص موسیقی کی باریکیوں سے واقف بھی نہیں ہوتا وہ ان محفلوں میں پہنچ کر اپنی دھنیں سناتا تو لوگ اسے واقعی موسیقار سمجھتے۔ انہی دنوں ایک پروفیسر کے گھر تقریب تھی۔ پروفیسر نے روسو کو مدعو کر لیا۔ اعلیٰ سوسائٹی میں متعارف ہونے کا یہ ایک اچھا موقع تھا لہٰذا روسو اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے یہ دعوت فوراً قبول کر لی۔ بڑی محنت سے ایک دھن تیار کی اور تقریب میں پہنچ گیا۔ معزز پروفیسر کی کوٹھی مہمانوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ جاگیردار' سرکاری افسران' تعلیم سے وابستہ لوگ غرض ہر قسم کے مہمان بے چینی سے عظیم موسیقار کا انتظار کر رہے تھے۔ آرکسٹرا تیار تھا۔ روسو بلیک سوٹ میں ملبوس اسٹیج پر آیا۔ زوردار تالیوں میں اس کا زبردست استقبال کیا۔ روسو نے معزز مہمانوں پر ایک نظر ڈالی۔ سر کو جنبش دے کر مہمانوں کی تالیوں کا جواب دیا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی پتلی چھڑی سے آرکسٹرا کو اشارہ کیا۔ اس کی بتائی ہوئی دھن نے ماحول میں شور مچایا، کچھ دیر تو مہمان مبہوت ہو کر اس اوٹ پٹانگ دھن کو سنتے رہے مگر کچھ دیر بعد ہی شور مچانے لگے۔ اتنا غل مچا کہ اسے اپنی دھن کو درمیان ہی میں روکنا پڑا۔

اس شرمناک رسوائی نے روسو کو بہت کچھ سکھایا۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ موسیقی کی تعلیم حاصل کرے گا تاکہ آئندہ اس قسم کی تقریبات میں اسے رسوائی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ وہ اپنی ذلت کا ازالہ اسی طرح کر سکتا

ہے۔ چنانچہ وہ باقاعدہ موسیقی سیکھنے لگا۔ ایسے بہت سے ادارے تھے جہاں یہ تعلیم دی جاتی تھی۔ اس نے بھی ایک ادارے سے رجوع کرلیا اور ایک عظیم موسیقار بننے کے خواب دیکھنے لگا۔

موسیقی کے اس ادارے میں ایک روز اس کی ملاقات ایک یونانی مشنری سے ہوئی۔ وہ یونان کے ایک کلیسا کا راہب تھا۔ اور مذہبی درس گاہوں کی مرمت کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض سے نکلا تھا، ردسو نے بھی اس سے ملاقات کی۔ وہ شخص ردسو کی ذہانت سے اتنا متاثر ہوا کہ فوراً اسے اپنا سیکریٹری بنانے کی پیش کش کردی۔

"میں تو سمجھتا ہوں کہ موسیقی سیکھ کر آپ اپنی صلاحیتوں کو ضائع کررہے ہیں۔" راہب نے کہا" یہ ایک دیرپا عمل ہے۔ تمام عمر بھی لگ جائے تو بھی اس میں کمال حاصل نہیں کرسکیں گے۔ آپ نوجوان ہیں آپ کو تو کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہیے کہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت کمائیں۔"

"آپ کے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟" ردسو نے کہا۔

"آپ میرے سیکریٹری بن جائیے۔ میں آپ کو بھاری تنخواہ بھی دوں گا اور آپ کو سیر و تفریح کے مواقع بھی ہاتھ آئیں گے۔"

ردسو کے لیے یہ ایک سنہری پیش کش تھی۔ وہ گھومنے پھرنے کا شائق تھا۔ راہب کے ساتھ مختلف شہروں کے دورے کا موقع مل سکتا تھا۔ کچھ کیے بغیر بھاری تنخواہ بھی ملنے والی تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جمع ہونے والے چندے میں خرد برد بھی کی جاسکتی ہے۔ اس نے تھوڑی سی حیل و حجت کے بعد راہب کا سیکریٹری بننا منظور کرلیا۔

یہ کام ردسو کے مطلب کا تھا۔ اعلیٰ سوسائٹی تک اس کی رسائی تبھی تھی۔ اس نے راہب کے ساتھ مل کر رقم بٹورنی شروع کردی۔ ان کی سرگرمیوں کو دیکھ کر حکومتی مشنری نے ان پر نظر رکھنی شروع کردی۔ فرانسیسی سفیر پر بہت جلد یہ حقیقت کھل گئی کہ یہ شخص راہب نہیں ہے بلکہ محض روپ دھارے ہوئے ہے۔ اس نے اس شخص کی گرفتاری کے احکام جاری کردیئے۔ راہب بھی ہوشیار تھا۔ اس نے خطرے کو بھانپ لیا اور رقم سمیٹ کر فرار ہوگیا۔ ردسو ہاتھ لگ گیا لیکن سفیر نے اسے گرفتار نہیں کیا بلکہ اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔ اس کی کوئی ادا ایسی پسند آئی کہ اس سفیر نے اسے اپنا سفیر بنالیا۔ یعنی جہاں اسے خود جانا ہوتا یا کوئی مشکل کام نکلوانا ہوتا وہ ردسو کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیج دیتا۔ ردسو یہ کام اتنی خوش اسلوبی سے انجام دے رہا تھا کہ سفیر اس پر بے انتہا اعتماد کرنے لگا۔ اس کی عمر اس وقت تقریباً بیس سال تھی اور وہ اپنے آپ کو بہترین منتظم ثابت کررہا تھا۔

فرانسیسی سفیر نے اسے کسی کام سے پیرس بھیجا تھا۔ وہ اس کام کی تکمیل کے بعد واپس آرہا تھا کہ اسے چمیری کے مقام پر اچانک مادام دے وارین نظر آگئی۔ وہ اب اپنے حلیے سے ایک غریب عورت نظر آرہی تھی لیکن اس کے چہرے کی دل کشی کم نہیں ہوئی تھی۔ ردسو کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ آگے بڑھی اور ردسو کو گلے سے لگالیا۔

"پیارے ردسو! تم کہاں غائب ہو۔ میں تو سمجھ رہی تھی تم اب تک پادری بن گئے ہوگے۔"

"شاید میرے نصیب میں یہ نہیں تھا۔"

"اب یہیں کھڑے رہوگے یا گھر بھی چلوگے۔"

"مجھے معلوم تو ہوا تھا کہ تم پیرس چلی گئی ہو لیکن میں تمہیں کہاں ڈھونڈتا۔"

"اب ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اب تم میرے ساتھ ہی رہنا۔"

وہ اس کے گھر پہنچا تو اسے یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ وہ ایک بوسیدہ سے گھر میں رہتی ہے جس کے کمرے تنگ و تاریک ہیں۔ وہ مادام کے اچھے دن دیکھ چکا تھا۔ اب اس کے پاس شاید دولت نہ ہو لیکن شفقت ضرور تھی اور ردسو کو اسی شفقت کی ضرورت تھی۔ وہ اسی بوسیدہ گھر میں رہنے لگا۔ مادام نے اس پر ایسا جادو کیا کہ اس نے لوزین جانے کا ارادہ ترک کردیا۔ مادام نے ارضی سروے کے محکمے میں اسے کلرک بھرتی کرادیا اور وہ کلرک بن گیا۔

یہ ملازمت کسی طرح بھی اس کے مزاج کے مطابق نہیں تھی۔ اسے آوارہ گردی کا چسکا پڑچکا تھا سرکاری دفتروں کے گھٹے ہوئے ماحول میں اس کا دل نہیں لگتا تھا لیکن اب وہ مادام سے دور بھی جانا نہیں چاہتا تھا۔ مادام سے اس کے تعلقات اب معاشقے کی حدوں میں داخل ہوگئے تھے۔ مادام کا بوسیدہ گھر اس کی جوانی کی آنکھ کا تارا بنا ہوا تھا۔ جب تک یہ نشہ اتر نہیں جاتا وہ یہاں رہنے پر مجبور تھا۔ مادام نوجوانوں پر رقم خرچ کرنے کی عادی تھی۔ ردسو اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔

ردسو نے یہ ملازمت جلد ہی ترک کردی۔ مادام نے اسے چمیری کے قریب ایک گاؤں میں بھیج دیا جہاں اس کا چھوٹا سا فارم تھا۔ دیہات کا ماحول 'کھلا جنگل' دور تک پھیلا ہوا میدان۔ برسات کے دنوں میں جگنوؤں کی قطاریں'

جاڑوں کے دنوں میں آسمان سے اترتی ہوئی چاندنی۔ یہ سب وہ مناظر تھے جو اس کے مزاج سے قریب تھے۔ یہاں پہنچ کر وہ مادام کے بدن کا لمس بھی بھول گیا۔ مطالعے کے لیے فرصت ہی فرصت تھی۔ اس کی تعلیم اب تک ادھوری رہی تھی۔ یہاں اسے ڈھیر ساری کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ وہ اپنا استاد خود تھا۔ مختلف علوم کی کتابیں توجہ سے پڑھتا رہا۔ کتابوں کے ضروری حصے ایک کاپی میں نوٹ کر لیتا۔ پھر ان حصوں پر غور کرتا رہتا۔ مختلف نتیجوں پر پہنچنے کی کوشش کرتا۔ کسی جنگل میں دور تک نکل جاتا۔ کسی درخت کے نیچے گوتم بدھ بن کر بیٹھ جاتا اور غور کرتا رہتا۔ سائنسی علوم میں دلچسپی لی، فلکیاتی مشاہدے کیے، جیومیٹری کی مشقیں حل کیں۔ جو علم اس نے درس گاہوں میں حاصل نہیں کیے، فطرت اسے خود بخود سکھا رہی تھی۔ یہ بھی عجیب بات تھی کہ اب اس کی طبیعت کے ہیجان میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنا مستقبل بنانے کی تیاری کے لیے اس علاقے کو یونیورسٹی کا درجہ دے چکا ہے۔

اس نے اس گاؤں میں تقریباً دس سال گزار دیے۔ اب اس کے پاس موسیقی کی نوٹیشن کا ایک جدید نظام تھا جو اس نے خود ایجاد کیا تھا۔ ایک ڈراما تھا، چند نظمیں اس کی جیب میں رکھی تھیں۔ بہت سے نظریات تھے جو اس نے فطرت کے کارخانے سے کمائے تھے۔ اب اسے ایک ایسی منڈی کی تلاش تھی جہاں ان اشیاء کی طلب ہو۔ اس کی جدید دنیا میں پیرس ہی وہ مقام تھا جہاں تھیٹر تھے، رقص گاہیں تھیں، ادب کے نقاد موجود تھے۔ موسیقی کے قدر دان تھے۔ اس نے اپنے سامان کا ایک مرتبہ پھر جائزہ لیا۔ مادام سے چھپ کر بھاگا اور سیدھا پیرس پہنچ کر دم لیا۔

پیرس کی اکادمی کے دروازے ہر باصلاحیت فرد کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ اس کی امیدوں کی سواری بھی اکادمی کے دروازے پر پہنچ کر رک گئی۔ اس نے موسیقی پر لکھا ہوا اپنا مقالہ اکادمی کے فضلا کے سامنے پیش کر دیا۔ اس مقالے کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی قائم کر دی گئی۔ روسو کو یقین تھا کہ اس نے جو نظام تشکیل دیا ہے کمیٹی اسے ضرور سر آنکھوں پر رکھے گی۔ پیرس میں دھوم مچ جائے گی۔

وہ چند دوستوں کے ساتھ ایک کیفے میں بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے کمیٹی کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ یہ فیصلہ یقیناً اس کے حق میں نہیں تھا اس لیے تعجب تو ہونا ہی چاہیے تھا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کسی نے یونہی خبر اڑا دی ہے۔ میرے مقالے کو رد کیا ہی نہیں جا سکتا۔''

''روسو، تم جذباتی مت بنو۔ کامیابی اور ناکامی دونوں راستے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ضروری تو نہیں کہ ہمیشہ کامیابی ہو۔''

''اس کمیٹی میں کون سا مشہور موسیقار شامل تھا۔ مجھے بتاؤ تاکہ میں اس سے جا کر معلوم کر سکوں کہ میرے مقالے میں کیا خامی تھی۔''

''تمہیں کمیٹی کے ارکان کے نام بھی نہیں معلوم۔''

''میں نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔''

''جہاں تک ہم دوستوں کی معلومات کا تعلق ہے اس کمیٹی میں موسیقی کے کسی ماہر کا نام شامل نہیں۔''

''یہ تو سراسر ناانصافی ہے اس کا مطلب ہے میرا یہ نظریہ بھی درست ہے کہ ناانصافی بڑی طاقت ہے۔ کردار کا یہ جھول بھی علوم و فنون کے ماہرین ہی کو زیب دیتا ہے۔''

''یہ تمہارا نظریہ ہو سکتا ہے۔''

''ہاں، میرا نظریہ ہے، اور اس لیے ہے کہ میرے ساتھ ہمیشہ ناانصافیاں ہی ہوتی رہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ دنیا کے شکاریوں کے سامنے میں کوئی اور شکار ڈال کر دیکھوں گا۔ اس نے اپنا ڈراما اسٹیج پر پیش کرنا چاہا لیکن کسی پروڈیوسر نے دلچسپی نہیں لی۔ اس کا یہ خواب بھی آنکھوں میں رہ گیا۔ معاشرے کے مزاج کے خلاف اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے دوست اسے تسلیاں دے رہے تھے۔ دیارِ غیر میں کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔ وہ ایک طویل آوارہ گردی کا آغاز کرنے والا تھا کہ ایک دوست نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''آوارگی ہی کرنی ہے تو اعلیٰ رتبوں کے حامل افراد کے ساتھ بیٹھ کر کرو۔ آدمی اگر بلندی سے گرتا ہے تو بلندی تک پہنچتا بھی تو ہے۔ گلی کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومو گے تو ہمیشہ زمین پر ہی پڑے رہو گے۔ کبھی بلندی تک نہیں پہنچ سکتے۔''

''جاگیردار طبقے کے افراد مجھے اپنے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیں گے۔ میں ان کی زندگیوں پر رشک ضرور کرتا ہوں لیکن ان کے درمیان میری جگہ کہاں بنتی ہے۔''

''تمہارے پاس ذہانت ہے۔ شاعری کی دولت ہے۔ کون ہوگا جو تمہیں اپنے پاس بٹھانا نہیں چاہے گا۔'' اس کے دوست نے کہا۔

''یہ تم بھی جانتے ہو، وہاں دولت کی گرم بازاری ہے۔''

''اس طبقے سے تمہیں میں متعارف کراؤں گا۔ تم ان بڑی محفلوں میں میرے ساتھ جاؤ گے۔ تم ان پر ثابت کرو گے

کہ تمہارے پاس دولت نہیں لیکن اور بہت کچھ ہے۔''
اس دوست نے اسے متعارف کرایا۔ اعلیٰ افسران۔ نواب اور شہزادوں تک اس کی رسائی ہوگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنی ذہانت اور نکتہ سنجی کی بدولت اعلیٰ طبقے میں گھل مل گیا۔
طبقاتی نظام میں متوسط طبقے کے ایک فرد کی اعلیٰ طبقے تک رسائی آسان بات نہیں تھی لیکن روسو نہ صرف وہاں تک پہنچ گیا تھا بلکہ ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔ ان محفلوں میں فیشن ایبل عورتیں بے حجابانا شریک ہوتی تھیں۔ روسو نوجوان تھا قدر و منزلت کی گلیوں سے گزر رہا تھا۔ ان خواتین کے ہجوم میں پہنچا تو پھولوں میں چھپ گیا۔ ان با اثر خواتین میں دو نام ایسے تھے جن سے ملنا جلنا دوستی کی حدوں کو پہنچ گیا۔ مادام دے کنتراں اور دو پاں طبقاتی بندھنوں کو بھلا کر اسے اپنی تنہائیوں میں شریک کرنے لگیں۔ اس کی نظموں کی شبنم ان پھولوں کے چہرے دھلانے میں مصروف ہوگئی۔ پتیوں پر نکھار آیا تو شبنم کی احسان مند ہوگئیں۔ وہ اپنی تیرہ بختیوں پر لکھی ہوئی نظمیں انہیں سناتا اور اپنے ساتھ انہیں بھی اداس کر دیتا۔ ان دونوں خواتین کے گھروں میں اس کو پیرس کی ممتاز شخصیات' ادیبوں' سائنس دانوں اور موسیقاروں سے ملنے کا موقع ملا۔ ان افراد میں جواں سال دیدرو بھی شامل تھا جو بہت جلد روسو کا جاں نثار دوست بن گیا۔
مادام دوپاں فرانس کے امیر ترین افراد میں سے ایک کی بیٹی اور دوسرے کی بیوی تھی۔ وہ روسو کی دکھ بھری نظمیں سن سن کر اتنی متاثر ہوئی اور اس کا اتنا خیال رکھنے لگی کہ روسو کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوگیا۔ اس نے ایک روز اسے محبت نامہ لکھ بھیجا۔ یہ اس کی ایسی جسارت تھی کہ گستاخی سے کم نہیں تھی لیکن دوپاں نے نہ صرف اسے معاف کر دیا بلکہ وینس میں اپنے ملک کے سفیر کے سیکریٹری کا عہدہ بھی دلوا دیا۔ ممکن ہے یہ عہدہ اس نے اس لیے دلوایا ہو کہ وہ پیرس سے چلا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس کی رسوائی کا سبب بن جائے۔
1743ء کے موسم بہار کے دن تھے جب آوارہ گرد شاعر کو اپنی نئی ذمے داریاں سنبھالنے کے لیے وینس روانہ ہونا پڑا۔ ایک مرتبہ پھر اس نے اپنے دل کے نہاں خانے میں اس امید کی شمع روشن کی کہ وہ جس سفیر کے پاس جا رہا ہے وہ ظاہر ہے سفیر ہے' معزز ہوگا۔ ذہانت کا شاہکار ہوگا۔ وہ اس سفیر سے بہت کچھ سیکھے گا۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے دن ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ لیکن وینس پہنچ کر جب وہ اس سفیر سے ملا تو جلتے ہوئے کوئلوں پر پانی کا چھینٹا پڑ گیا۔ اس کے سامنے ایک ایسا شخص بیٹھا تھا جو شکل ہی سے نکما اور بے وقوف لگ رہا تھا۔
وہ بڑی حقارت کے ساتھ پیش آیا۔ روسو کو یقین ہوگیا کہ وہ اس کے ساتھ زیادہ دیر تک نہیں رہ سکے گا۔ اس نے ان حالات کے باوجود تہیہ کرلیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ عرصے تک یہاں رہنے کی کوشش کرے گا۔ روسو خلافِ توقع اپنی ذمے داریاں سنبھال رہا تھا لیکن اس کا سابقہ ایک ایسے آدمی سے پڑا تھا جو اپنے ماتحتوں سے کبھی خوش نہیں ہوتا تھا۔ روسو کے ہر کام میں کیڑے نکالتا تھا۔ روسو بھی تیز مزاج کا تھا لہٰذا جلد ہی جھگڑے شروع ہوگئے۔ ان جھگڑوں کے باوجود روسو نے اٹھارہ ماہ گزار دیے۔ پھر ایک روز اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا۔ اس نے ایک خطرناک جھگڑا مول لیا اور استعفیٰ دے کر پیرس لوٹ آیا۔
وہ انگارے چھوڑ کر پھولوں کی آرزو میں لوٹ آیا تھا۔ معزز خواتین کی کشش اسے کھینچ کر لائی تھی۔ اسے امید تھی کہ یہ خواتین اور خاص طور پر مادام دوپاں اسے کوئی اور ملازمت دلوا دیں گی۔ اسی لیے وہ پیرس میں داخل ہوتے ہی مادام دوپاں کے گھر گیا تھا۔ دربان نے فوراً آکر یہ جواب دیا کہ مادام آرام کر رہی ہیں لہٰذا آپ کسی اور وقت آئیے گا۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ جب چاہتا تھا چلا آتا تھا اس نے صبر کا کڑوا گھونٹ پیا اور چلا آیا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ملنے کی کوشش کی لیکن اس مرتبہ بھی اسے کامیابی نہ مل سکی۔ پھر ایک محفل میں وہ مل ہی گئی تو طبقاتی نظام کی شکنیں اس کے ماتھے پر نمایاں نظر آرہی تھیں۔ وہ روسو سے اس طرح مخاطب ہوئی جیسے بلندی' پستی کو دیکھتی ہے۔
''یہ تم نے کیسا لباس پہنا ہوا ہے۔ لوگ تمہیں میرے ساتھ دیکھیں گے تو میرے بارے میں کیا خیال کریں گے۔''
''مادام' میں تو ہمیشہ یہی لباس پہنتا رہا ہوں۔''
'اچھا! میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ میں اپنی سیکریٹری سے کہوں گی کہ وہ اس غریب شاعر کو اچھی سی کوئی پوشاک سلوا کر دیدے۔''
''مادام' مجھے آپ بڑے اشتیاق سے اپنی دعوتوں میں بلواتی تھیں۔''
''ہاں یاد آیا۔ تم نے مجھے محبت نامہ بھی تو تحریر کیا تھا۔''
''وہ میری بھول تھی۔ میں سمجھا تھا ہم دونوں انسان ہیں۔''
''کیڑے مکوڑے یہی سوچتے رہتے ہیں۔'' مادام نے کہا اور رنگ و نور کے ہجوم میں گم ہوگئی۔
روسو نے سوچا یہ عورت اس کے تحریر کردہ محبت نامے کا غصہ اتار رہی تھی۔ مادام دے کنتراں بھی اس کے قدر

دانوں میں ہے۔ وہ ضرور اس کی مدد کرے گی لیکن اس نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ وہ وقت کے سینے پر پاؤں رکھے کھڑا تھا لیکن اس کے ہاتھ آسمان کی بلندی کو چھونے سے قاصر تھے۔ وہ ایک ایسے معاشرے میں زندہ تھا جہاں انسانوں کو دولت اور ذات پات سے پرکھا جاتا ہے۔ اس کے پاس ان میں سے کچھ نہیں تھا۔ ایک مرتبہ پھر اعلیٰ قدروں اور اعلیٰ سوسائٹی کی طرف سے اس کے دل میں نفرت کے الاؤ روشن ہوگئے۔ میں ایسی جگہ کیوں رہوں جہاں اعلیٰ طبقے کے گھٹیا افراد کا آمنا سامنا ہوتا رہے۔ اس نے موجودہ معقول ہوٹل سے اپنا سامان اٹھایا اور ایک گھٹیا سے ہوٹل میں پہنچ گیا جسے زیادہ سے زیادہ ایک بھٹیار خانہ کہا جاسکتا تھا۔ اس ہوٹل کے ایک گندے سے کمرے میں سامان رکھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اصل زندگی تو یہی ہے جو فطرت سے قریب تر ہے۔ اہلِ ثروت نے فطرت کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ تعلقات کا نام تہذیب و تمدن رکھ دیا ہے۔ بے رحمی اور ناانصافی، یہی تو ہے ان لوگوں کا سرمایہ ان لوگوں کے لباس اجلے ہیں مگر کردار میلے ہیں۔ بستر پر لیٹ کر وہ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر ہوٹل کی مالکن سے ملنے چلا گیا۔ اس وقت ہوٹل کی مالکن کے پاس کچھ مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ واپس آنے والا تھا لیکن مالکن نے اسے اصرار کرکے بٹھالیا۔ روسو نے ان مہمانوں کے درمیان بیٹھنے کے بعد جب محفل کا جائزہ لیا تو اس کی نظر ایک نیم دیہاتی معمولی شکل وصورت کی دوشیزہ پر پڑی جو یقیناً ملازمہ تھی۔ اس لیے کہ مہمانوں کی خدمت کررہی تھی۔ اس کی عمر ایسی تو نہیں کہ مالکن کے حکم پر ناچتی رہے۔ روسو کے دل میں رحم کے جذبات ابھرے حالانکہ ایسے جذبات کی اس سے توقع نہیں کی جاسکتی لیکن وہ اس وقت جس کیفیت سے گزر رہا تھا۔ طبقاتی نظام کے خلاف جو غصہ اس کے دل میں تھا، ایک غریب دوشیزہ کو دیکھ کر یہی جذبات ابھرنے چاہیے تھے۔ وہ قہوہ لے کر اس کے پاس آئی تو اس نے ایسی نظروں سے اس کی طرف دیکھا جس کا مفہوم ہر لڑکی خوب سمجھتی ہے۔

دوسرے دن وہ پھر مالکن کے پاس بیٹھا تھا۔ اسے ملازمہ سے دلچسپی تھی اور وہ اس کا نام تک نہیں جانتا تھا، مالکن روسو کی شائستہ گفتگو سے بے حد متاثر تھی۔ وہ چاہتا بھی یہی تھا کہ مالکن کو زیادہ سے زیادہ اعتماد میں لے سکے۔ وہ باتیں مالکن سے کررہا تھا لیکن نظریں ملازمہ پر لگی ہوئی تھیں اس ملازمہ کے بھدے نقش ونگار میں نہ جانے اسے کیا نظر آگیا تھا۔

''اے لڑکی! سنو کیا نام ہے تمہارا؟'' روسو نے اکھڑ لہجے میں اسے پکارا۔

''ٹریزے ہے میرا نام۔'' لڑکی نے یوں جواب دیا جیسے پتھر کھینچ کر مار دیا ہو۔

روسو کو سادہ لوگوں کا کرخت لہجہ اور گنوار پن اچھا لگتا تھا، ٹریزے نے جس انداز میں اپنا نام بتایا تھا وہ انداز روسو کے دل میں اتر گیا۔ وہ جواب دیتے ہوئے عام لڑکیوں کی طرح شرمائی بھی نہیں تھی۔ روسو کے نزدیک شرماتا وہ ہے جس کے دل میں چور ہوتا ہے۔ ٹریزے کی بے تکلفی نے اسے لاجواب کردیا تھا۔

روسو کو جلد ہی معلوم ہوگیا کہ ٹریزے ہوٹل کے مہمانوں کے لیے ملازم رکھی گئی ہے بلکہ وہ مالکن کی خاص ملازمہ ہے اور مالکن کا رویہ اس کے ساتھ بہت خراب ہے۔ اب وہ کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا جب مالکن کی غیر موجودگی میں ٹریزے سے اس کی ملاقات ہو، تاکہ وہ اس کے بارے میں کچھ ضروری باتیں جان سکے۔ اس نے دیکھا کہ اکثر مالکن کاؤنٹر پر آکر بیٹھ جاتی ہے اور ٹریزے اس کے کمرے کی صفائی ستھرائی کے لیے وہیں رک جاتی ہے۔ ایسے ہی ایک موقع پر وہ ٹریزے سے ملنے پہنچ گیا۔

''کیا ہے۔ یہاں کیوں آئے۔ جانتے نہیں کہ یہ مالکن کا کمرا ہے۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔'' ٹریزے نے اسے دیکھ کر کہا۔

''یہاں تم بھی تو ہو۔ میں تم سے ملنے آیا ہوں۔''

''مجھ سے ملنے آئے ہو؟ بیٹھو۔ کیوں ملنے آئے ہو؟''

''ٹریزے، تمہارے ماں باپ ہیں؟''

''ہیں۔ کیوں نہیں ہیں مگر کچھ کرتے رہتے نہیں ہیں، بس میری کمائی پر گزارا کرتے ہیں۔''

''پھر تو تم بہت غریب ہوگی۔''

''غریب نہیں ہوتی تو یہاں ملازمت کرتی؟''

''میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں اپنی بیوی بناؤں گا۔''

''میرا کیا ہے۔ تمہارے ساتھ بھی رہ لوں گی مگر میرے ماں باپ بھی میرے ساتھ رہیں گے۔''

''یہ کیا شرط ہوئی؟''

''شرط منظور نہیں تو چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

''ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔''

''میں گھر کا انتظام کرلوں پھر تمہیں لے چلوں گا اور ہاں دیکھو! اپنی مالکن کو کچھ نہ بتانا۔''

''میں جھوٹ نہیں بولتی۔''

''اگر اسے معلوم ہوگیا تو وہ تمہیں یہاں سے کبھی

نہیں جانے دے گی۔''

''میں نے کہانا' میں جھوٹ نہیں بولتی۔''

''اگر وہ پوچھے تو بتادینا۔ اپنے آپ کچھ مت بتانا۔''

''میں کیوں بتاؤں گی' میں کوئی پاگل ہوں؟''

روسو ہوٹل سے نکلا اور دیدرو سے ملنے کے لیے اس کے گھر پہنچ گیا۔ دیدرو سے اس کی دوستی ابھی تک چلی آرہی تھی اور اسے یقین تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی انتظام کردے گا۔

''دیدرو' میں شادی کررہا ہوں۔''

''مبارک ہو مگر کس سے؟''

''میں جس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں وہاں ایک ملازمہ ہے' ٹریزے۔''

''پاگل تو نہیں ہوگئے ہو۔ ایک ملازمہ سے شادی کروگے۔ کیا بالکل ہی تباہ ہونا چاہتے ہو۔''

''وہ لڑکی فطرت کی طرح سادہ ہے۔ یہی میرا نظریۂ حیات ہے۔''

''یہ سادگی اور کہیں بھی مل سکتی ہے۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شہر کبھی جنگل نہیں بن سکتے۔''

''خیر' مجھے کیا۔ اب بتاؤ مجھ سے کیا چاہتے ہو۔''

''اسے ہمیشہ ہوٹل میں تو نہیں رکھوں گا' کوئی گھر بھی تو چاہیے۔''

دیدرو کی کوششوں سے اسے ایک گھر مل گیا۔ وہ ٹریزے کو اس گھر میں اٹھالایا۔ وہ اکیلی نہیں آئی وعدے کے مطابق وہ اپنے والدین کو بھی اپنے ساتھ لائی تھی۔

روسو یہ کہہ کر ٹریزے کو اپنے ساتھ لایا تھا کہ وہ اسے اپنی بیوی بنائے گا۔ اس نے اسے بیوی ضرور بنایا لیکن شادی نہیں کی۔ وہ شادی کے بغیر ہی میاں' بیوی کی حیثیت میں رہنے لگے۔ شاید وہ شادی کو بھی فطرت کے خلاف سازش سمجھتا تھا۔ شاید ٹریزے کو یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ شادی کے بغیر کوئی لڑکی بیوی نہیں بن سکتی۔

روسو کے دوست جب ٹریزے سے ملتے تھے تو سر پیٹ لیتے تھے کہ روسو کس لڑکی کو گھر لے آیا۔ جو لڑکی گھڑی دیکھ کر وقت بھی نہیں بتاسکتی' روسو اس کے ساتھ کیسے خوش رہ سکتا ہے۔ بات یہ تھی کہ اس کے دوست جو کچھ ٹریزے میں دیکھنا چاہتے تھے روسو کو ان خوبیوں کی تلاش ہی نہیں تھی اور جو کچھ وہ ٹریزے میں دیکھتا تھا وہ اس کے دوستوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتا تھا۔

☆☆☆

فرانس کوئی معمولی ملک نہیں تھا۔ وہ برطانیہ کے بعد دنیا کی دوسری بڑی طاقت تھا۔ دولت کی ریل پیل تھی' کئی براعظموں میں اس کی فتوحات جاری تھیں۔ اس کی نوآبادیاں قائم ہورہی تھیں مگر اس کی یہ دولت وقوت اس کے طبقہ امرا کے قبضے میں تھی۔ اس چھوٹے سے طبقے کے مقابلے میں آبادی کی بڑی تعداد غربت اور محرومی کی زندگی گزار رہی تھی۔ جاگیردارانہ نظام کی عمل داری تھی جس میں شہری طبقہ ترقی کرنے کے باوجود عزت واحترام اور ملکی امور میں کوئی کردار ادا کرنے سے محروم تھا۔ عوام پر ٹیکسوں کی بھرمار تھی۔ اس ظالمانہ نظام میں ذہن وفکر اور تحریر وتقریر کی گنجائش کہاں نکل سکتی تھی۔ کلیسا' ظلم واستحصال کو برقرار رکھنے والا ادارہ بن چکا تھا۔ رواداری رخصت ہوچکی تھی۔ اس کے برعکس فرانس کے ہم سائے میں آزادی کا دریا بہہ رہا تھا۔ برطانیہ سیاسی' سماجی اور مذہبی آزادی کے اعتبار سے نہ صرف یورپ بلکہ پوری دنیا کے لیے بہترین نمونہ تھا۔ ملک میں شخصی حکومت ختم ہوچکی تھی اور ایک بااختیار پارلیمنٹ وجود میں آچکی تھی۔ یہ خبریں فرانس تک پہنچے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں اور پہنچ رہی تھیں۔ ان پرکشش خبروں نے ایک روشن اور آزاد خیال طبقہ فرانس میں بھی پیدا کردیا تھا۔ اس طبقے کے نزدیک فرانس کا اصل مرض جہالت' تعصب اور مذہبی تنگ نظری تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ فرانس کو ان امراض سے نجات دلائے بغیر آزادی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ فرانس کو آزاد کرانے کے لیے ایک انقلاب کی ضرورت ہے لیکن انقلاب برپا کرنے کے لیے پہلے اس کی راہ ہموار کرنے کی ضرورت ہے۔ ان آزاد خیال دانشوروں نے یہ کام اپنی تحریروں سے لینا چاہا۔ روسو کا دوست دیدرو اس تحریری مہم کا روحِ رواں تھا اور جب ان نوجوان دانش وروں نے ایک انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت کا بندوبست کیا تو دیدرو کو اس کا مدیر بنادیا گیا۔

طبقہ امرا کی طرف سے روسو کے جو جذبات تھے' دیدرو اس سے واقف تھا لہٰذا اس نے روسو کو بھی آمادہ کرلیا کہ وہ اس انسائیکلوپیڈیا کے لیے مضامین کا سلسلہ شروع کرے۔ روسو سمجھتا تھا کہ فرانس کی موسیقی طبقہ امرا کی قدامت پسندی کی طرح قدیم ہے۔ اس موسیقی کو عوامی لب ولہجہ ملنا چاہیے۔ اس نے موسیقی کے موضوع پر مقالات لکھنے شروع کردیے۔

یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ اعلیٰ طبقوں میں اس انسائیکلوپیڈیا کا نوٹس لیا جانے لگا۔ یہ لوگ نئے خیالات اور نئے علوم وفنون کو فرانس سے متعارف کرارہے تھے۔ مذہبی اور سیاسی حلقوں کے نزدیک یہ کوششیں خطرناک تھیں اور انہیں روکنے کی ضرورت تھی۔ ایک ایک لفظ ایک ایک تحریر کا جائزہ

لیا جانے لگا' آخرکار ایک بہانہ ہاتھ آ ہی گیا۔ دیدرو نے ایک مضمون ''اندھوں کے بارے میں ایک مکتوب'' کے عنوان سے لکھا۔ حکمران طبقے کو اس کی یہ ادا پسند نہ آئی اور اسے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔

جب خوف کی دھند کچھ کم ہوئی اور دوسرے ساتھیوں کو یقین آ گیا کہ صرف دیدرو کو گرفتار کرنا مقصود تھا تو روسو نے اپنی روپوشی ختم کی اور دیدرو سے ملنے ون سینے کی جیل کی طرف روانہ ہوا جہاں اس کا دوست سلاخوں کے پیچھے بند تھا۔

1749ء کی ایک گرم سہ پہر کو روسو جیل کی طرف رواں دواں تھا کہ ایک اخبار پر اس کی نظر پڑی۔ اس اخبار میں ایک انعامی تحریری مقابلے کی اطلاع شائع ہوئی تھی۔ یہ اعلان ویژون کی اکادمی کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔ یہ اکادمی فرانس کے علمی اداروں میں نمایاں مقام رکھتی تھی اور ان تمام اکادمیوں سے پرانی تھی جو دارالحکومت پیرس سے باہر وجود میں آ گئی تھیں۔ انعام کے لالچ میں روسو نے اس اعلان کو جلدی جلدی پڑھنا شروع کیا اور جب وہ مضمون کے موضوع تک پہنچا تو خوشی سے اس کا دل اچھلنے لگا۔ موضوع تھا ''علوم وفنون کی ترقی نے اخلاق سدھارنے میں مدد دی ہے یا ان کو بگاڑ دیا ہے۔''

یہ موضوع روسو کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ مدت سے اس موضوع پر لکھنا چاہتا تھا۔ اب کوئی اس سے لکھوانا چاہتا ہے تو کیوں نہ لکھے۔ اس کے ذہن میں سیکڑوں چراغ چل اٹھے۔ خیالات نے یلغار کر دی۔ نئے نئے نکات سوجھنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں اس مضمون کو تحریر کرنے لگا، اسے چلنے میں دشواری پیش آنے لگی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ کچھ دور چل کر وہ بالکل ہی نڈھال ہو گیا۔ ایک درخت سامنے تھا وہ اس درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ انسان اپنی فطرت میں نیک ہے۔ یہ ادارے ہی ہیں جو اس کا ستیاناس کرتے ہیں۔

وہ بہت دیر تک اپنی حالت پر غور کرتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ابھی ابھی کس نفسیاتی مرحلے سے گزرا ہے اور کیوں اس کی یہ حالت ہوئی، کیا یہ کوئی کشف تھا؟ اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔ اسے یاد آیا کہ وہ اپنے دوست دیدرو سے ملنے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے آنسو پونچھے، اپنی جگہ سے اٹھا اور جیل کی طرف چل دیا۔

وہ جیل پہنچا اور دیدرو سے ملا تو دیدرو اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ چہرے پر الجھن اور تذبذب کی ایسی پرچھائیاں تھیں کہ دیدرو انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

''روسو! کیا ہم برسوں بعد مل رہے ہیں؟''

''نہیں تو''

''کیا تم طویل بیماری سے اٹھ کر آ رہے ہو؟''

''یہ بات بھی نہیں مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''اس لیے کہ تمہارا چہرہ بیماروں کی طرح لگ رہا ہے۔''

''مجھے شک تھا کہ میرے چہرے سے تم میری کیفیت بھانپ لو گے۔''

''کیا بات ہے روسو۔''

روسو نے اس کے استفسار پر خود پر گزرنے والی کیفیت سے اسے آگاہ کر دیا۔ دیدرو بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ جب وہ اپنی بات مکمل کر چکا تو دیدرو نے اسے مشورہ دیا کہ اس پیش کش کو قبول کر لے۔

''تمہیں قدرت نے یہ موقع دیا ہے۔ اسے ضائع مت کرو۔ فوراً گھر جاؤ اپنے خیالات قلم بند کرو۔ مقالہ مکمل کرو اور پیش کر دو۔''

اس نے دیدرو سے اجازت لی اور گھر کی طرف چل دیا۔ اسے گھر پہنچنے کی اتنی جلدی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اس کے ذہن میں ابھرنے والے خیالات کہیں اس کی گرفت سے نہ نکل جائیں۔ وہ جلد از جلد انہیں کاغذ پر منتقل کر لینا چاہتا تھا۔ کئی مرتبہ تو یہ خیال آیا کہ یہیں کسی سڑک کے کنارے لکھنے بیٹھ جائے لیکن وہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کا گھر اس کے سامنے آ گیا۔

کمرے میں کھڑکی کے نیچے رکھے صندوق پر کھانا سجائے اس کی بیوی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دونوں اسی صندوق پر کھانا رکھ کر کھاتے تھے۔

''آج تو بہت دیر کر دی۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے، تمہیں ہوش ہی نہیں۔''

''اٹھا لو یہ کھانا۔ مجھے کچھ لکھنا ہے۔''

''میری بلا سے نہیں کھاتے تو نہ کھاؤ۔ ابا کے لیے دوا کے پیسے تو دے دو، ان کی طبعیت کل سے بہت خراب ہے۔''

''نہیں ہیں میرے پاس پیسے۔ انہیں کسی محتاج خانے میں داخل کرا دو۔'' اس نے کہا اور ٹریزے کو دھکا دے کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ یہ کھردری زندگی ہی تو اسے پسند تھی اور اسی لیے ٹریزے اسے پسند تھی۔ وہ بھی اس کی طرح سخت اور کھردری تھی لیکن دل کی بہت اچھی تھی۔ اس لیے یہ لڑائی چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں چل پاتی تھی۔

کمرا بند ہوتے ہی خیالات نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس نے تمام نکات ایک ایک کر کے کاغذ پر منتقل کرنے شروع کر دیے۔ دروازے پر مستقل دستک ہو رہی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا یہ ٹریزے ہوگی لیکن وہ اس وقت قلم روکنے کے حق میں نہیں تھا۔ دستک نے دم توڑ دیا۔ ٹریزے مایوس ہو کر واپس چلی گئی تھی۔ اس کا قلم تیزی سے چل رہا تھا رات میں کسی وقت پھر دستک ہوئی۔ اب وہ تمام نکات کاغذ پر اتار چکا تھا۔ ذہن کی دکان خالی ہو چکی تھی' اب وہ خود چاہتا تھا کہ تھکے ہوئے ذہن کو کچھ دیر کے لیے آرام دے۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

''شکر ہے تم زندہ ہو۔ میں سمجھ رہی تھی تم نے خودکشی کر لی۔''

''تم کیوں یہ چاہتی ہو کہ میں مر جاؤں۔''

''میں اگر یہ چاہتی تو بار بار دروازے پر کیوں آتی۔ کھول کیوں نہیں رہے تھے دروازہ۔''

''بات یہ ہے کہ میں ایک زبردست مضمون لکھنے والا ہوں۔ اس مضمون کے مکمل ہوتے ہی ہمارے حالات بدل جائیں گے۔''

''پھر تم ابا کا علاج کراؤ گے۔''

''میں نے ان کے لیے بات کر لی ہے۔ میں انہیں محتاج خانے میں داخل کرا دوں گا۔ وہ لوگ خود ان کا علاج کرائیں گے۔''

''کیا! تم میرے باپ کو محتاج خانے میں داخل کراؤ گے؟''

''میں کیا کروں گا۔ اس بات کو اس وقت جانے دو۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔''

''میں کچھ بولوں گی تو تم مجھے کمرے سے نکال دو گے۔ اس لیے میں چپ ہوئی جاتی ہوں۔'' ٹریزے نے کہا اور بستر پر لیٹ گئی۔

روسو بھی بظاہر لیٹ گیا تھا لیکن اس کی نیند اڑ گئی تھی۔ وہ مقالہ لکھنے کے لیے اپنے ذہن میں خاکہ تیار کر رہا تھا، تمام نکات ایک ایک کر کے اس کے ذہن پر یلغار کر رہے تھے' وہ اس لڑائی کو لڑتے لڑتے کسی وقت سو گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو ٹریزے اسے جھنجوڑ رہی تھی۔ ''اٹھو نا کھڑکی میں بیٹھ کر چڑیوں کو نہیں دیکھو گے؟''

''تمہیں معلوم ہے رات کو کس وقت سویا تھا۔ کیوں پریشان کر رہی ہو۔''

''مجھے کیا خبر کب سوئے تھے' جاؤ میں بھی نہیں دیکھتی چڑیاں۔''

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں روز صبح کو کھڑکی کے پاس بیٹھ کر پرندوں کو اڑتے ہوئے دیکھا کرتے تھے۔ روسو نے سوچا اگر وہ بستر سے نہ اٹھا تو بے چاری ٹریزے بھی اس منظر سے لطف اندوز نہیں ہو سکے گی۔

کچھ دیر بعد ٹریزے ناشتا لے کر آ گئی' ابھی وہ ناشتا کر ہی رہا تھا کہ ٹریزے کی ماں کمرے میں داخل ہوئی' خلافِ معمول اس کے چہرے پر ہنسی تھی وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ناشتے کی صندوق تک آئی اور روسو کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''میں نے سنا ہے تم بہت جلد امیر آدمی بننے والے ہو۔''

''آپ سے کس نے کہہ دیا؟''

''ٹریزے بتا رہی تھی کہ تمہیں بہت جلد انعام کی رقم ملنے والی ہے۔ میرے لیے سونے کا نیکلس لانا مت بھولنا۔''

''اوہ! تو یہ بات تھی۔ لالچی بڑھیا۔'' روسو نے دل ہی دل میں سوچا اور تسلی دے کر اسے رخصت کیا۔ وہ ٹریزے کی ماں کی لالچی فطرت سے بہت تنگ تھا لیکن ٹریزے کی محبت میں کسی نہ کسی طرح اس کا بوجھ اٹھائے جا رہا تھا۔

ٹریزے کو معلوم ہو گیا تھا کہ روسو ناراض نہیں ہے بلکہ اس پر لکھنے کا بھوت سوار ہو چکا ہے اور جب تک وہ اپنا کام مکمل نہیں کر لیتا ہوش میں نہیں آئے گا لہٰذا وہ اس کی بے نیازی برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ وہ جب کچھ لکھنے بیٹھتا تھا اس کا رویہ ایسا ہی ہو جاتا تھا۔ ٹریزے اب اس کی عادی ہو چکی تھی۔

روسو کئی دن تک تانے بانے بنتا رہا اور پھر مقالہ لکھنے بیٹھ گیا۔ اسے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اس موضوع کے تحت اکادمی نے جو سوال اٹھائے ہیں ان سب کے جواب اسے کشف کے ذریعے حاصل ہو گئے ہیں۔

اس نے مقابلے میں حصہ لینے کے لے مقالہ لکھا اور اکادمی کو پیش کر دیا۔ اکادمی کی طرف سے اٹھائے ہوئے سوال کا اس نے جو جواب دیا وہ یہ تھا کہ ''علوم و فنون کی ترقی نے اخلاق و آداب تباہ کر دیئے ہیں۔ تہذیب و تمدن نے ہر جگہ انسانوں کو اخلاقی اور جسمانی اعتبار سے کمزور بنا دیا ہے۔ صرف وہی قومیں اور گروہ مضبوط ہیں اور نیکی کی راہ پر چل رہے ہیں جنہوں نے اپنی قدیم سادگی برقرار رکھی ہے۔ علوم و فنون کے فروغ سے سماج گھاٹے میں رہتا ہے۔ اس سے بد اخلاقی اور زوال کی قسمتوں کو تقویت ملتی ہے۔'' اس نے اس مقالے میں یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ علوم و فنون کا منبع گناہ اور بدی میں ہے۔ مثلاً فلکیات کی ابتدا توہمات سے ہوئی۔ فصاحت

و بلاغت کی ابتدا چاپلوسی' چالبازی' نفرت اور خواہشات سے ہوئی۔ ریاضی نے لالچ سے اور طبیعات نے فضول حیرت سے جنم لیا۔ جبکہ اخلاقیات کا منبع غرور ہے۔ مختصر یہ کہ ہر علم کی ابتدا برائی سے ہوتی ہے علوم کا مقصد بھی گھٹیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر علم سیاسی' اخلاقی اور سماجی گراوٹ کا باعث بنا ہے۔ فنون اور عیش پرستی ایک ساتھ چلتے ہیں۔ عیش پرستی کا باعث بننے کی وجہ سے علوم وفنون کو مکروہ اور مذموم مشاغل سمجھنا چاہیے۔''

روسو نے یہ سب خیالات اٹھارھویں صدی کے وسط میں قلمبند کیے تھے۔ یہ سائنس اور علوم پر یقین کے دن تھے۔ لوگ علوم وفنون کے احیا سے بہت سی امیدیں وابستہ کیے ہوئے تھے۔ اس ماحول میں جب اس نے ان خیالات کا اظہار کیا تو بہت سے لوگ چونک اٹھے۔

اکادمی کے انعامی مقابلے میں چودہ افراد نے حصہ لیا تھا لیکن انعام روسو کے حصے میں آیا۔ یہ مقالہ جیسے ہی شائع ہوا فرانس کی علمی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ عبارت کا ہر لفظ انوکھا بھی تھا اور دہکتا ہوا انگارہ بھی۔ ایسے انوکھے خیالات کے حامل فرد کے بارے میں ہر کوئی جاننا چاہتا تھا۔

اس ایک تحریر نے اسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اسے وہ سب کچھ حاصل ہوگیا جس کا وہ اب تک خواہش مند رہا تھا۔ اس کے رد اور حق میں مضامین اور پمفلٹ شائع ہوئے لیکن یہ ایسا معاملہ تھا کہ اس کی تردید بھی اس کی شہرت کا سبب بن گئی۔ اس کے خیالات اتنے چونکا دینے والے اور اس کا اسلوب ایسا پرجوش تھا کہ بہت سے لوگ اس انوکھے مصنف سے ملنے کے مشتاق ہوگئے۔ اس کے گھر کے سامنے بگھیوں کی قطاریں لگ گئیں۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اپنے پرستاروں سے تفصیلی ملاقات کرسکے۔ انعام میں ملنے والی رقم نے اس کے مالی معاملات کو بھی سنبھالا دیا۔ لالچی... ساس کے لیے نیکلس بھی بن گیا البتہ ٹریزے کو کچھ نہیں چاہیے تھا۔ وہ صرف اس سے خوش تھی کہ اس کا روسو اب مشہور آدمی بن گیا ہے۔

☆☆☆

زندگی کے طویل برسوں میں کوئی ایک پل کسی بہت بڑی تبدیلی کا باعث بن جاتا ہے۔ یہی روسو کے ساتھ ہوا دیدرو کی جیل کی طرف جانے والی سڑک پر گزارے ہوئے چند لمحات نے نہ صرف اس کی زندگی کو بدل ڈالا کہ وہ تصنیف وتالیف کی طرف مائل ہوا بلکہ اس کے طرز فکر نے جدید یورپ کو ایک ایسا عقیدہ دے دیا جو بہت سے ذہنوں کو متاثر کرنے کے لیے بہت اہم تھا۔ اسے یہ عقیدہ ہاتھ آیا کہ تہذیب نے انسانوں کو اخلاقی اور روحانی اعتبار سے بدحال کردیا ہے۔ یہ ایک بنیادی نکتہ تھا جس پر اسے مسلسل کام کرنا تھا۔

روسو کے بیان کردہ نقطہ نظر سے یہ سوال واضح طور پر ابھر کر سامنے آتا تھا کہ اگر علوم وفنون اور تہذیب وتمدن اخلاقی زوال کا باعث بنتے ہیں تو کیا اس سے بچنے کے لیے فطرت کی آغوش میں پناہ نہیں لینی چاہیے۔ یہی وہ سوال تھا جو روسو کو بہت پریشان کررہا تھا۔ معترضین کے سوالوں کے جوابات دیتے دیتے جب وہ تھک گیا تو اس نے اپنی زندگی کو اپنے نظریے کے مطابق ڈھال کر اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی۔ اس نے ملازمت چھوڑ.. دی اور گزارے کے لیے موسیقی کی نقلیں تیار کرنے لگا۔ یہ ایک سادہ سا کام تھا اور اسے فطرت سے ہم آہنگ سمجھا جاسکتا تھا۔ اس نے اپنی گھڑی یہ کہہ کر فروخت کردی کہ جب فطرت انسان کو دن اور رات کا فرق بتادیتی ہے تو گھڑی رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح نئے زمانے کی جو دو چار چیزیں اس کے پاس تھیں اس نے ان چیزوں سے بھی جان چھڑالی۔ اپنی ان حرکتوں سے وہ ایک عجوبہ روزگار شخص بن گیا۔ جو لوگ اس کا فلسفہ سمجھنے سے قاصر تھے' اس کا طرز حیات دیکھ کر اس کے افکار کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ اٹھارھویں صدی کے فرانس میں کئی صدیوں پہلے کا آدمی لگنے لگا تھا۔

وہ طرز حیات کے ان نمونوں سے عام لوگوں کو قائل یا متاثر کرسکتا تھا لیکن دانش ور طبقہ دلائل مانگتا تھا۔ اس کے مخالفین مضامین لکھ رہے تھے۔ اسے لامحالہ ان کا جواب دینا پڑتا تھا۔ جواب در جواب کا یہ سلسلہ باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کرگیا۔ یہ جنگ اس کی تربیت کا حصہ بن گئی۔ اسے دوسروں کی بات سننے اور اپنی بات کہنے کا ڈھنگ آگیا۔ غور وفکر کرنے کی عادت پڑی اور وہ باقاعدہ فلسفی کا روپ دھارنے لگا۔

اس نے اس مرحلے پر بڑی ہوشیاری سے اس جنگ سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے ایک ڈراما لکھ مارا۔ اس ڈرامے کے دیباچے میں اس نے پہلے سے بھی زیادہ نزاعی بحث چھیڑ دی۔ اس نے لکھا ''علم ہر خاص وعام کے لیے نہیں بلکہ ان ذہین افراد کے لیے ہے جو سب کی بھلائی کے لیے برسرپیکار رہتے ہیں۔'' دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ خود بھی ذہین لوگوں کی صف میں ہے۔ اب وہ واضح طور پر طبقہ خواص سے انتقام لینے پر تل گیا تھا۔ اس کی تحریریں وہ تلخی صاف نظر آتی تھی جو اس کے حالات نے اسے دی تھی۔

اس کا ستارۂ قسمت مستقل عروج کی طرف گامزن تھا۔

ابھی اس دیباچے کی گونج کم نہیں ہوئی تھی کہ اس نے ایک چھوٹا اوپیرا کمپوز کیا۔ یہ اوپیرا لوگوں میں بے حد مقبول ہوا حتیٰ کہ بادشاہِ فرانس نے اسے دربار میں طلب کیا۔ شاہی سپاہی جب یہ پیغام دینے اس کے گھر پہنچے تو وہ بدحواس ہوگیا۔ دوسرے دن وہ گھر۔۔۔۔سے نکلا اور دربار جانے کے بجائے کسی جگہ روپوش ہوگیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ بادشاہ اس کے لیے سزا کا اعلان کرے گا۔ اس نے رائج الوقت نظام پر طنز کیا تھا اس لیے خوف زدہ تھا لیکن ہوا اس کے برعکس' اس کی غیر موجودگی میں بادشاہ نے اس کے لیے انعام کا اعلان کردیا۔

اس حوصلہ افزائی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ اب وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا کہ موقع ملے اور وہ اس نظام پر بھرپور حملہ کرے۔ اسے اب اتنی شہرت حاصل ہوگئی تھی کہ وہ مخالفین کی پروا کیے بغیر اپنے خیالات کا اظہار کرسکتا تھا۔

وہ موقع کی تلاش میں تھا کہ 1753ء میں یہ موقع اسے مل گیا۔ ویژون اکادمی نے مقالہ نگاری کے لیے ایک اور انعامی مقابلے کا اعلان کیا۔ اس بار ''انسانی اونچ نیچ کا منبع اور اس کے اسباب'' کا موضوع چنا گیا۔ یہ موضوع اس کے حملے کے لیے اتنا موزوں تھا کہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ قدرت خود اس کی مدد کررہی ہے۔ ایسے مواقع عطا ہورہے ہیں جن میں وہ اپنے خیالات کا اظہار کرسکتا ہے۔ اس نے مقالہ لکھنے کا ارادہ کرلیا اور خیالات کو مجتمع کرنے کے لیے فطرت کا قرب حاصل کرنے لیے پیرس کی شہری زندگی سے دور نکل گیا۔ آبادی سے دور، عین جنگل کے درمیان اس نے قدیم زمانوں کو تلاش کیا۔ تخیل کے رتھ پر بیٹھ کر ہر دور میں بدلتے ہوئے انسان کے مختلف روپ مشاہدہ کیے۔ وقت کے ارتقا کا پیچھا کیا۔ ان اسباب کی چھان بین کی جنھوں نے انسان کی فطرت کو مسخ کیا ہے۔ اس گیان دھیان کے نتیجے میں وہ اس یقین تک پہنچا کہ قدیم انسان اخلاقی اعتبار سے نہ اچھا تھا نہ برا۔ جب انسان نے خاندانی زندگی اختیار کی، جائیداد کا تصور پیدا ہوا تھا۔ یہ سنہری دور تھا۔ اس لیے سنہری تھا کہ انسان حیوانوں سے ممتاز ہوچکا تھا لیکن ابھی تہذیب کی آلودگیوں سے محفوظ تھا۔ اس کے بعد جب کھیتی باڑی کا تصور پیدا ہوا۔ نجی ملکیت کا تصور پختہ ہوا تو دست نگری اور غلامی کو فروغ ملا۔ خود غرضی میں اضافہ ہوا۔ تیسرے انقلاب کی صورت میں ریاست وجود میں آئی تو سب کچھ ختم ہوگیا۔ بالادستوں نے زیردستوں کو قابو میں رکھنے کے لیے ہر ممکن تدبیر کرنی شروع کردی۔ بظاہر ایک نظام کی بنیاد پڑی لیکن اس کی بنیاد ظلم اور بالادستی پر ہے۔

وہ اس گیان یاترا سے واپس لوٹا تو اسے یوں لگا جیسے غاروں سے نکل کر پیرس کی روشن سڑکوں پر آگیا ہو۔ کیفے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اس نے دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر ہنسی آگئی۔ یہ سب ایک دوسرے کو دھوکا دے رہے ہیں۔ ہر زیردست' بالادست کو خوش رکھنے کی کوشش کررہا ہے۔ یہ سب اس نظام کا حصہ ہیں جس کی بنیاد خودغرضی پر ہے۔ وہ گھر پہنچا تو ٹریزے نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔ یہ عورت صرف اس لیے میرا استقبال کررہی ہے کہ میں اس سے خوش ہوجاؤں' اس نے سوچا میں بھی تو اس کو اسی لیے گھر میں رکھ رہا ہوں کہ یہ میرے کام آتی ہے' ہم دونوں اسی نظام کا حصہ ہیں جس کی بنیاد خودغرضی پر ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی مخلص نہیں۔

وہ ان خیالات کو قلم بند کرنے بیٹھ گیا۔ ٹریزے کی ماں پھر خوش ہوگئی کہ اب وہ پھر کوئی ایسا کام کررہا ہے جس کے نتیجے میں اسے کوئی بھاری رقم ملے گی۔ وہ حیلے بہانوں سے اپنی فرمائشیں بھی نوٹ کرانے لگی۔

روسو کو اس سے پہلے انعام مل چکا تھا۔ اس لیے وہ بہت مطمئن تھا۔ اس کا حد سے بڑھا ہوا اعتبار اس کے لہجے کو پرجوش بنا رہا تھا۔ اسے اپنے مخالفین کے تعصبات کا پاس نہیں تھا۔ اب وہ صرف سچائی بیان کررہا تھا۔ وہ سچائی جو اس کے تجربے میں آئی تھی۔ وہ قدیم زمانے کے انسان سے مخاطب تھا۔ سماجی نظام کے زخموں کا آپریشن کررہا تھا۔

اس کا مقالہ اکادمی کے جج صاحبان کے سامنے پہنچا۔ طشت میں رکھے انگاروں سے ہاتھ جلنے لگے۔ اس نے اپنا مؤقف اس جوش اور ولولے سے بیان کیا تھا کہ ججوں کے کانوں میں انقلاب زندہ باد کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اس مقالے کو انعام دینے کی پاداش میں کہیں ان پر کوئی مصیبت نہ ٹوٹ پڑے۔ ان ججوں نے باہم فیصلہ کیا اور اس کا یہ مقالہ انعام سے محروم ہوگیا۔

اس کی بیوی ٹریزے کو تو خیر یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ انعام کیوں ملتا ہے اور کیوں نہیں ملتا۔ نہیں ملتا تو اس سے فرق کیا پڑتا ہے لیکن اس کی ماں کو معلوم ہوا کہ اس مرتبہ روسو انعام کی رقم سے محروم رہ گیا ہے تو اس کی زبان قینچی بن گئی۔ وہ اپنے داماد کی نااہلی پر کئی دن تک برافروختہ رہی۔ یہ افسوس الگ تھا کہ اس کی فرمائشیں رائیگاں گئیں۔

روسو اس حق تلفی پر ذرا بھی چراغ پا نہ تھا۔ اس کے خیال میں ویژون اکادمی چونکہ صوبائی درجے کی ایک اکادمی تھی لہٰذا اس کی اقدار کے حوالے سے یہ مقالہ ضرورت سے زیادہ

جرأت مندانہ تھا اس لیے اسے کیسے قابلِ قبول ہوتا۔

وہ رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ سے بے زار تھا۔ خودغرضیوں کے ہجوم میں گھرا ہوا اکیلا انسان تھا۔ پیرس کی پررونق زندگی اس کی آنکھوں کو خیرہ ضرور کرتی تھی لیکن اس کا دل کہیں اور آباد تھا۔ اب وہ آوارہ گرد نہیں' ایک معزز شہری تھا لیکن اس کے باوجود اس کا دل بار بار جنیوا کی طرف کھنچتا تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ پیرس کے آزاد خیال دانش ور اس کی ذہنی دنیا میں انقلاب برپا کررہے تھے خصوصاً مذہب کے بارے میں ان دانش وروں کے خیالات اسے ہلچل میں مبتلا کررہے تھے۔ وہ خود مذہبی ذہن رکھتا تھا جبکہ پیرس کے علمی حلقوں میں انگلستان کی زیرِ اثر عقلی تحریک کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ یہ خیالات عام ہوتے جارہے تھے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کا اظہار روحی کے بجائے فطری عقل کے ذریعے ہوتا ہے اور فطری عقل کے وسیلے ہی سے انسان خدا تک رسائی پا سکتا ہے۔ خالق اور مخلوق کے درمیان رابطے کے لیے کسی اور وسیلے کی ضرورت نہیں۔ جدید سائنس کی نشو ونما اس تحریک کو پھلنے پھولنے میں مدد دے رہی تھی۔ وہ ان آوازوں سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ کبھی شہرت کے پیچھے بھاگا کرتا تھا اب اس سے خوف زدہ تھا۔ درباروں کی سیاست سے دور۔ خوشامد اور چاپلوسی سے دور کسی گوشۂ عافیت میں پناہ کا خواستگار تھا۔

وہ فرار کے کئی چور راستوں سے واقف تھا 1754ء کے موسمِ گرما میں اس نے ٹریزے کو ساتھ لیا اور جنیوا کی طرف چل پڑا۔ راستے میں ''سوائے'' سے گزر رہا تھا کہ اسے اپنی پرانی محبت مادام دے وارین کی یاد آئی۔ ''اس خوش گوار چہرے کی زیارت کرلوں پھر آگے بڑھتا ہوں۔'' وہ سوائے میں رک گیا۔ یہ وہی شہر تھا جہاں وہ پہلی مرتبہ گھر سے بھاگ کر پہنچا تھا اور پادریوں کی خانقاہ میں ٹھہرا تھا۔ یہیں اس نے اپنے آبائی فرقے کو خیرباد کہا تھا اور یہیں وہ پہلے پہل مادام دے وارین سے ملا تھا۔ یہ سب سوچ کر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس کی طرح مادام بھی بھاگتی رہی تھی اپنے عاشق بدلتی ہوئی کئی شہروں میں پہنچی۔ روسو ہر جگہ اس سے ملتا رہا یا یوں کہیے کہ ہر جگہ وہ اس کے سامنے آتی رہی۔ اب روسو کو معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے پرانے مستقر یعنی ''سوائے'' میں لوٹ آئی ہے اور غربت کی زندگی گزار رہی ہے۔ روسو نے صرف اندازہ کیا تھا۔ اس نے دیکھا نہیں تاکہ غربت کیا ہوتی ہے۔ اس نے تو اس وقت دیکھا جب وہ اس کے مکان پر پہنچا اور مادام اسے لینے دروازے پر آئی۔ غربت کی دیمک نے اس کے حسن کو چاٹ لیا تھا۔ صرف چوّن سال کی عمر میں اس کا چہرہ جھریوں سے بھر گیا تھا۔

اس کے کپڑے کثیف تھے۔ کیا یہ وہی مادام دے وارین ہے جس کے پاس کبھی مجھے پادری نے بھیجا تھا؟ اس کا مکان اس کے چاہنے والوں سے بھرا رہتا تھا۔ نوکر چاکر تھے' مادام قیمتی لباس زیب تن کرتی تھی۔ کیا سب نے آنکھیں پھیر لیں؟ اپنے سماج کی بے رحمی کا ایک اور ثبوت اس کے سامنے تھا۔ اسے اپنے تجربات کی سچائی پر یقین آگیا۔ تہذیب و تمدن کی ترقی نے انسانیت کو کتنا فراموش کردیا ہے۔

مادام شرمندگی اور حیرانی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کبھی روسو کو دیکھ رہی تھی کبھی ٹریزے کو۔ اس نے اس سے پہلے ٹریزے کو کبھی روسو کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ اسی لیے وہ حیران تھی۔

''یہ ٹریزے ہے' میری بیوی۔'' روسو نے اس کی حیرانی کو بھانپتے ہوئے کہا۔

''اچھا! تم نے شادی کرلی۔ مجھے بتایا بھی نہیں۔ اب بھی اطلاع کیے بغیر آگئے' یہ لڑکی پہلی مرتبہ میرے گھر آئی ہے اور میں اس کی کوئی خدمت بھی نہیں کرسکتی۔ اس وقت تو یہ معمولی انگوٹھی ہے میری انگلی میں۔'' مادام نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتاری اور ٹریزے کو پہنانی چاہی۔ ٹریزے نے اس کا ہاتھ چوما اور انگوٹھی دوبارہ مادام کی انگلی میں ڈال دی۔ ٹریزے کے آنسو مادام کے خلوص کو بوسے دے رہے تھے۔

''مادام' تم ہمارے ساتھ جنیوا چلو۔ ٹریزے تمہارا بہت خیال رکھے گی۔ یہ بہت اچھی لڑکی ہے۔'' روسو نے کہا۔

''میں یہاں اچھی خاصی ہوں۔ تمہارے ساتھ جا کر کیا کروں گی؟''

''میں کبھی تمہارے پاس رہتا تھا۔ کیا اب تم میرے پاس نہیں رہ سکتیں؟''

''روسو پیارے' اب مجھے کسی پر اعتبار نہیں رہا۔ تنہائی میری سہیلی ہے' اسے کیسے چھوڑ دوں۔''

روسو اور ٹریزے مل کر تقاضے کرتے رہے۔ اصرار کے باوجود وہ ان کے ساتھ جانے پر تیار نہیں ہوئی حالانکہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ کئی کئی دن کے فاقے اس پر گزر جاتے ہوں گے۔ روسو نے چلتے وقت کچھ رقم اس کے ہاتھ پر رکھی اور اس کے گھر سے نکل آیا۔

جنیوا پہنچنے کی خوشی اسے بے قرار کررہی تھی۔ مادام کے اصرار کے باوجود وہ وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا اور جنیوا پہنچ گیا جہاں اس کے رشتے دار اب بھی موجود تھے۔

وہ خوش تھا کہ اپنے وطن میں آگیا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ وہ یہاں رہ نہیں سکتا تو پریشان ہوگیا۔ پروٹسٹنٹ مذہب

کوتیاگ کر کیتھولک عقیدہ قبول کرنے کے باعث وہ جنیوا کے شہری حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ کلسیائی زبانیں اس کی موجودگی کی خبر سنتے ہی حرکت میں آگئیں۔ روسو اس حملے سے بچاؤ کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے بائبل کے مسلسل مطالعے اور غور وفکر کی عادت کی وجہ سے مذہب کی اصل روح کو سمجھ لیا ہے۔ جو لوگ مسیح کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے انہوں نے مسیح کے کلام کی عجیب وغریب تاویلات گھڑ لی ہیں۔ یہ فرقے انہی تاویلات کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو قبول کرنے سے ایمان پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے کلیسا کے بڑے پادری کے سامنے پہنچ کر کیتھولک عقیدہ قبول کرلیا۔

''میں کیتھولک مذہب پر پیدا ہوا تھا۔ آئندہ اسی عقیدے پر چلتا رہوں گا۔ اس پر چلتے ہوئے خدا سے نجات طلب کروں گا۔''

اسے اس شہر کی شہریت دوبارہ مل گئی۔ اب اسے یہاں رہنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اس نے یہاں رہنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ شہریت کے حصول میں چند ماہ لگ گئے تھے۔ اب اسے ایک مرتبہ پھر پیرس جانا تھا کہ اپنا اسباب وغیرہ سمیٹ سکے۔ ابھی تو وہ جائزہ لینے آیا تھا۔ پیرس میں ٹریزے کے والدین بھی تھے‘ انہیں بھی جنیوا لے کر آنا تھا۔

☆☆☆

پروشیا کا شہزادہ فریڈرک بادشاہ اور فریڈرک اعظم بنا تو اس نے اپنے دوست‘ فرانس کے مشہور فلسفی والتیئر کو اپنے دربار میں طلب کرلیا وہ اتنے اصرار کے بعد گیا تھا کہ بادشاہ نے آگے بڑھ کر خود اس کا استقبال کیا‘ کسی درباری کا ایسا استقبال نہ ہوا ہوگا۔ بادشاہ اس کے ہاتھ تھام کر اسے تخت شاہی تک لے گیا اور اپنے پہلو میں جگہ دی۔

وہ حاضر جواب تھا‘ تیز وطرار تھا۔ دربار میں آتا تو سب پر چھا جاتا۔ کسی کا چراغ جلنے نہ پاتا لہٰذا حاسدوں نے ہاتھ بڑھائے اور اس کے سر پر سجائے ہوئے عزت کے تاج ایک ایک کر کے اتار لیے۔ یہاں تک کہ بادشاہ کو اس کے خلاف بدظن کردیا۔ اب اس کی شوخیاں بادشاہ کو گستاخیاں نظر آنے لگیں۔ والتیئر نے بھی ہوا کے رخ کو پہچان لیا اور اس سے پہلے کے کوئی چنگاری شعلہ بنتی وہ بادشاہ کی بادشاہت سے نکل گیا۔ وہ ہواؤں سے کھیلتا ہوا پہلے فرینک فرٹ اور پھر سوئٹزرلینڈ پہنچ گیا اور پھر 12 دسمبر 1754ء کو وہ جنیوا پہنچ گیا۔ اس کی آمد سے صرف دو مہینے پہلے روسو پیرس کی طرف لوٹ گیا تھا کہ ضروری بندوبست کر کے مستقل رہائش کے لیے دوبارہ جنیوا آسکے۔

جنیوا میں داخل ہونے سے پہلے والتیئر خوش تھا کہ جنیوا کے مشہور شہری روسو سے مل سکے گا۔ کوئی تو ہوگا جو اس کی قدر دانی کا حق ادا کرے گا لیکن شاید جس طرح دو بادشاہ ایک مملکت میں نہیں رہ سکتے اسی طرح دو فلسفی ایک شہر میں نہیں رہ سکتے تھے۔ والتیئر ایک دروازے سے داخل ہوا اور روسو دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔

والتیئر نے اپنی تحریروں‘ چالاکیوں اور اثر ورسوخ کے ذریعے بہت سی دولت سمیٹ لی تھی۔ وہ شاہانہ زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ جنیوا پہنچا تو جھیل کے کنارے ایک عالی شان گھر خرید لیا۔ وہ تو جہاں رہتا پریوں اور تماش بینوں کی بھیڑ جمع کرلیتا تھا۔ وہ جنیوا میں کیا ٹھہرا‘ جھیل کے کنارے روشنی کا بازار لگ گیا۔ اس کی حویلی کیا تھی شہر کا ثقافتی مرکز تھی۔ امرا کسی دربار کی طرح اس کی حویلی میں داخل ہوتے۔ شہریوں کے لیے اس کی شخصیت اور اس کا عالیشان مکان کسی جادونگری سے کم نہیں تھا۔ شہریوں کے دل اس کے لیے دھڑکنے لگے۔

روسو ان خبروں سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ پیرس اس نیت سے آیا تھا کہ اپنا سب کچھ سمیٹ کر جنیوا چلا جائے گا لیکن والتیئر کی موجودگی نے اس کا ارادہ متزلزل کردیا۔ والتیئر کے ہوتے ہوئے جنیوا میں اس کا پہنچنا مشکل تھا۔ اس کی سلطنت پر کوئی اور قابض ہو چکا تھا۔ مسکین طبع‘ مفلوک الحال روسو نے اس سے دور رہنے ہی میں عافیت سمجھی۔ اس صورت حال میں روسو نے یہی بہتر سمجھا کہ والتیئر سے ملے بغیر وہ اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے۔ اس کا دوسرا مقالہ شائع ہو چکا تھا۔ اس نے اس مقالے کا ایک نسخہ والتیئر کو بھیجا۔

روسو سمجھ رہا تھا کہ والتیئر اس کی کاوش کی داد دے گا۔ اسے سراہے گا لیکن والتیئر کا جواب آیا۔

''انسانی نسل کے خلاف آپ کی نئی کتاب مجھ کو مل گئی ہے اور میں اس عنایت کے لیے شکر گزار ہوں۔ ہم سب کو بدھو بنانے کے لیے کسی اور نے کبھی آپ جیسی دانائی سے کام نہیں لیا ہوگا۔ یہ کتاب پڑھ کر ہاتھ پاؤں کے بل چلنے کو جی چاہتا ہے مگر کیا کروں۔ ساٹھ سال سے زیادہ عرصے سے یہ بات بھول چکا ہوں۔ اب دوبارہ اس کو اپنانے میں ناکامی کا مجھے افسوس ہے......''

والتیئر کا یہ خط پڑھتے ہوئے روسو کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ والتیئر نے اس کی کتاب کا یوں مذاق اڑایا تھا کہ دوستی کے پردے میں دشمنی کی تھی لیکن والتیئر عمر میں اس سے سولہ سال بڑا تھا‘ شہرت میں اس سے کہیں زیادہ تھا۔ اس نے

معاملے کو طول دینا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے اس خط کے جواب میں منافقانہ دوستی کا رویہ اختیار کیا۔ اس نے والتیئر کی برتری کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا۔

''مجھے اس عزت ووقار کا بھرپور احساس ہے جو اس (والتیئر) نے اس شہر (جنیوا) کو اپنی موجودگی سے عطا کیا ہے۔ اس کے قیام اور تشریف آوری پر جنیوا کے شہری شکر گزار ہیں اور وہ خود بھی اس جذبے میں شریک ہے۔''

☆☆☆

پرتگال کے شہر لزبن میں مذہبی تہوار منایا جارہا تھا۔ شہر کے گرجے عبادت گزاروں سے بھرے ہوئے تھے۔ زمین نے کروٹ لی اور عمارتیں جھولا جھولنے لگیں۔ زلزلے کے جھٹکوں نے قیامت نازل کردی۔ کوئی عبادت، کوئی دعا کام نہ آئی۔ ملبے کے ڈھیر اٹھے تو تیس ہزار افراد لقمۂ اجل بن چکے تھے۔

انسانی مصائب کی یہ ہولناک داستان دیکھتے دیکھتے پوری دنیا میں پھیل گئی۔ والتیئر نے سنا تو وہ بے اختیار چیخ اٹھا ''یہ کیسا خدا ہے جو بے نیازی سے مخلوق کو روندڈالتا ہے۔''

یہ ہولناک تباہی دیکھ کر بعض ذہنوں میں خدا کی موجودگی کے بارے میں شبہات پیدا ہونے لگے تھے۔ یہ بے دینوں کا مذہب تھا۔ والتیئر کے دل میں یہی وسوسہ پیدا ہوا۔ اس نے کائنات کے پیچھے کسی منظم قوت کی موجودگی اور خدائی انصاف کا تصور مسترد کردیا۔

ابھی اس حادثے کو ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا۔ جذبات تازہ تھے۔ غصہ عروج پر تھا کہ وہ نظم لکھنے بیٹھ گیا۔ ابھی غصہ تو فرو ہوا نہیں تھا۔ جو جی میں آیا لکھتا چلا گیا۔ نظم میں اس نے یہ ماننے سے انکار کردیا کہ جو کچھ ہورہا ہے ٹھیک ہورہا ہے۔ اس نے کلیسائی دانش وروں کو چیلنج کیا کہ وہ بتائیں کہ اگر خدا نے ہماری اس دنیا کو تمام امکانی دنیاؤں سے بہتر بنایا ہے تو پھر انسانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ کیوں ٹوٹتے ہیں۔ ہزاروں معصوم انسان خدا کی عبادت کرتے ہوئے پل بھر میں ہلاک کیوں ہوجاتے ہیں۔ اگر خدا سراپا خیر ہے اور قادرِ مطلق ہے تو پھر دنیا میں اس قدر ظلم اور بدی کیوں ہے۔

روسو نے اس نظم کی شدید مخالفت کی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ نظم منافقت کا شاہکار ہے۔ والتیئر خود تو زندگی کی نعمتوں، مسرتوں اور خوبصورتیوں سے لطف اندوز ہورہا ہے اور دوسروں کو زندگی کی بے معنویت، بے ہودگی اور مایوسی کا درس دے رہا ہے۔

والتیئر ایسا آتش مزاج تھا کہ اگر وہ اس تبصرے کا جواب دیتا تو مخالفت کے شدید شعلے بھڑک سکتے تھے لیکن اس نے غیر متوقع درگزر سے کام لیا اور دونوں میں جھگڑا بڑھ نہ سکا اور منافقت آمیز دوستی کا پردہ برقرار رہا۔

انہی دنوں پیرس میں انسائیکلو پیڈیا کی اشاعت شروع ہوچکی تھی۔ اس کا مقصد فرانس میں روشن خیالی اور عقل پرستی کو رواج دینا تھا۔ ڈینس دیدرو اس منصوبے کا انچارج اور مدیر تھا۔ ژاں آلمبیر اس کا معاون تھا۔ یہ دونوں روسو کے دوست تھے انہوں نے روسو کو انسائیکلو پیڈیا کے لیے چند مقالات لکھنے کی دعوت دی۔ روسو کے خیال میں یہ انسائیکلو پیڈیا بوسیدہ جاگیرداری کے خلاف انقلاب برپا کرنے والا تھا۔ اس لیے وہ فوراً آمادہ ہوگیا۔ اس اشتراک سے سماجی طور پر روسو کو یہ فائدہ پہنچا کہ پیرس کے بعض اعلیٰ خاندان روسو کے قریب آگئے۔

روسو اب ڈھنگ کی زندگی گزار رہا تھا۔ اوٹ پٹانگ حرکتوں کو خیرباد کہہ چکا تھا۔ سماجی لحاظ سے قابلِ احترام بھی تھا اور مالی اعتبار سے آسودہ بھی۔ ٹریزے کے باپ کو وہ محتاج خانے بھجوا چکا تھا البتہ اس کی لالچی ساس ابھی تک اس کے ساتھ تھی۔ اس کی فرمائشوں کا دائرہ روز بروز بڑھتا جارہا تھا۔

اپینے خاندان پیرس کے دولت مند گھرانوں میں سے ایک تھا۔ مادام اپینے کی ایک حویلی مونٹ مورنسی کی وادی میں واقع تھی۔ دور تک درختوں کے غلاف میں چھپی یہ وادی کسی حسین خواب کی طرح خوبصورت تھی۔ وہ کئی مرتبہ مادام سے اس وادی کی خوبصورتی کا تذکرہ کرچکا تھا۔ دل میں سوچتا بھی تھا کہ رہنے کا لطف تو اس وادی میں ہے ایک دن وہ مادام سے ملنے گیا ہوا تھا۔ اپینے خاندان کے بعض دوسرے لوگ بھی اس کی گفتگو میں شریک ہوگئے۔ وہ اس وقت شہری اور دیہی زندگی کا موازنہ کررہا تھا۔

''آپ جس جوش وخروش سے دیہی زندگی کی شان میں قصیدہ خواں ہیں اس سے تو یہ لگتا ہے کہ پیرس میں آپ مجبوری کے دن کاٹ رہے ہیں۔''

''شور، کیچڑ اور دھویں سے بھرے اس شہر میں واقعی میں زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں۔''

''آپ کو تو کسی دیہی علاقے میں ہونا چاہیے تھا۔''

''آپ نے درست کہا۔ فطرت سے قریب رہنا میری آرزو ہے چاہے کچھ دنوں کے لیے ہی ہو۔''

''آپ اگر کچھ خیال نہ کریں تو میری مونٹ مورنسی والی وادی میں دن گزار سکتے ہیں۔''

''کیا واقعی؟''

''بالکل' آپ جب چاہیں وہاں منتقل ہو جائیں۔''

روسو اس پیش کش سے اتنا خوش تھا کہ مادام کا شکریہ ادا کرنا بھی بھول گیا۔ اسی وقت اٹھا اور گھر پہنچ کر ٹریزے کو یہ خوش خبری سنا دی۔ سامان سمیٹا اور اپنے خاندان کی جاگیر میں پہنچ گیا۔ وہ مجبور تھا کہ ٹریزے کی ماں کو بھی اپنے ساتھ لے کر جائے۔ وہ اس عورت کی لالچی طبیعت سے ناخوش تھا لیکن گھر کی دیکھ بھال میں وہ اتنی طاق تھی کہ روسو اس کے وجود کو برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

مونٹ مورنسی کی دلکش وادی میں پہنچتے ہی وہ ہواؤں کے ساتھ مل کر گیت گانے لگا۔ وہ اور ٹریزے.... دن بھر اس وادی میں گھومتے رہتے۔ تھک جاتے تو درختوں کی چھاؤں میں ستانے کے لیے لیٹ جاتے۔ دیہی زندگی اس کا خواب تھا اور یہ خواب اب پورا ہو رہا تھا۔ یہاں کی خاموشی اور تنہائی اسے لکھنے پر اکسانے لگی۔ دن بھر اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد جب وہ رات کو لکھنے بیٹھتا تو خیالات اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے۔ اس نے کئی کتابوں کے لیے خاکے تیار کیے۔ کئی نظریات اپنی نوٹ بک میں تحریر کر لیے کہ وہ ایک ایک کر کے ان پر کام شروع کر دے گا۔ وہ اپنی تحریروں سے روشن خیالی کے پھول کھلا دینا چاہتا تھا اور وقت اسے اس کی اجازت دے رہا تھا۔

وہ بے فکری کے جھولے میں جھول رہا تھا کہ ایک لڑکی اس کی زندگی میں آ گئی۔ اس کا نام سوفی تھا اور وہ مادام اپینے کی نند تھی۔ دل کش وادی کے پتھر بھی دست آذر کے ہنر مند ہاتھوں سے تراشے ہوئے لگتے تھے' اس نے اس لڑکی کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ صاحبِ دل تھا' فطرت کا دل دادہ تھا۔ سوفی کی سادگی نے اسے بے دام خرید لیا۔ سوفی بھی اس کی ذہین آنکھوں کی چمک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ سوفی کو ایک اچھا باتیں کرنے والا مل گیا تھا۔ اب ٹریزے کے بجائے وہ سوفی کے ساتھ گھومتا نظر آنے لگا۔ ٹریزے کو تو خیر پروا بھی نہ ہوتی لیکن اس کی ماں کی تجربہ کار آنکھوں نے اس تبدیلی کو محسوس کر لیا۔ اس نے ٹریزے کو بھی بھڑکانے کی کوشش کی لیکن جب اس سے کام نہ چلا تو اس نے روسو کے دوست دیدرو کے سامنے تمام صورت حال رکھی۔ مادام اپینے تک بات پہنچی۔ وہ اعلیٰ خاندان کی خاتون تھی۔ یہ کیسے گوارا کر سکتی تھی کہ اس کی نند کا معاشقہ روسو سے ہو اور پھر رسوائی ان کی حویلی تک چلی آئی۔ فرانس کے طبقاتی نظام میں یہ معاشقہ بڑی ذلت کا باعث بن سکتا تھا۔ مادام اپینے نے بہتر سمجھا کہ سوفی سے بات کر لی جائے اس کے بعد وہ کوئی قدم اٹھائے گی۔

''سوفی! مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔''

''مادام اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔ آپ جو پوچھنا چاہتی ہیں بلا تامل پوچھیں۔''

''کچھ ایسی خبریں آ رہی ہیں کہ روسو سے تمہارا تعلق بہت بڑھ گیا ہے۔''

''تعلق سے اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں اسے کچھ وقت دے دیتی ہوں تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔''

''صرف وقت دینے کا مسئلہ نہیں ہے لوگ اسے کوئی اور معنی پہنا رہے ہیں۔''

''آپ نے اسے رہنے کے لیے اپنی حویلی دی۔ کیا اسے بھی کوئی معنی پہنا دوں؟''

''میری بات اور ہے میں شادی شدہ ہوں۔ ہمارے نظام میں کنواری لڑکیوں پر بڑی سختی کی جاتی ہے۔ پھر میں نے تو سرپرستی کرتے ہوئے اسے حویلی میں رہنے کی اجازت دی ہے۔''

''اگر روسو اسے آپ کی محبت سمجھے؟''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو۔''

''اسی قسم کی سرپرستی میں کر رہی ہوں۔ اب اگر وہ اس کا کوئی اور مطلب لے تو میرا کیا قصور۔''

''تم احتیاط تو کر سکتی ہو، اسے کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا مت ہونے دو۔''

''میں کوشش کروں گی کہ اس سے پیچھا چھڑا لوں۔''

روسو کی ساس بھی شاید کسی موقعے کی تلاش میں تھی۔ مادام اپینے ہی نے اس سے کہا ہو کہ وہ سوفی سے بات کرے۔ اس بوڑھی عورت نے اس انداز میں اس سے بات کی کہ سوفی کو اپنی حیثیت کم تر نظر آنے لگی۔ اب ایسے ویسے لوگ بھی مجھ سے میرے معاشقوں پر بات کرنے لگے ہیں۔ ان ہی دنوں اس کا منگیتر سیاں لامبریت آ گیا۔

پے در پے واقعات ایسے ہوئے کہ سوفی اس سے کھنچنے لگی۔ درختوں کے وادی میں پروان چڑھنے والی محبت صرف چار ماہ برقرار رہ سکی۔ سوفی نے یوں اس سے آنکھیں پھیر لیں کہ روسو کا دل کٹ کر رہ گیا۔ وہ سوفی کو بے قصور سمجھتا تھا۔ اسے اپنے دوست دیدرو اور مادام پر غصہ تھا۔ اس کے خیال میں ان لوگوں نے سازش کر کے سوفی کو اس سے دور کر دیا تھا۔ وہ ایک دن اپنی محسنہ مادام اپینے سے جھگڑ پڑا۔ اس نے بھی ترکی بہ ترکی سنائیں۔

''جو حالات پیدا ہو گئے ہیں وہ اس کا تقاضا کرتے ہیں کہ میں آپ کے مکان کو فوراً خالی کر دوں۔'' روسو نے یہ سوچ

کر کہا کہ یہ دھمکی کارگر ہوگی اور مادام اسے روک لے گی لیکن مادام نے الٹا ہی جواب دیا۔
"اگر تمہاری مرضی یہی ہے تو کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔"
"میں ایک ہفتہ بھی اس مکان میں نہیں رہ سکتا۔"
"کل کے بجائے آج چلے جاؤ۔" مادام نے کہا۔
اتنی بے عزتی کے بعد وہ اس مکان میں نہیں رہ سکتا تھا لیکن وادی چھوڑ کر کہیں اور جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اسی وادی میں ایک اور گھر کرائے پر لیا اور اس میں رہنے لگا۔
اس نے مکان چھوڑ دیا تھا لیکن سوفی کا خیال نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اس سے محبت کرتی ہو یا نہ کرتی ہو لیکن وہ اس کی محبت میں شرابور تھا۔ وہ ان سب سے انتقام لینا چاہتا تھا جنہوں نے ایک سازش کے تحت اس کی سوفی کو اس سے دور کر دیا تھا۔ مادام پر تو وہ اپنا غصہ اتار چکا تھا اور اپنی دانست میں اس کا مکان چھوڑ کر اس نے اپنی بے عزتی کا بدلہ بھی لے لیا تھا لیکن دیدرو اور اس کا معاون آلمبیر باقی تھے۔ یہ دونوں اس کے دوست تھے مگر اب وہ انہیں بدترین دشمن سمجھتا تھا اور انہیں ذلیل کرنے کے لیے موقعے کی تلاش میں تھا۔ اسی غصے کے عالم میں آلمبیر کا ایک مقالہ اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ اس مقالے میں کم از کم دو ایسی باتیں تھیں جو غالباً والتیئر کے ایما پر لکھی گئی تھیں اور یہی دو باتیں روسو کو سخت ناگوار گزریں۔ عام حالات میں وہ ان باتوں کو نظر انداز کر سکتا تھا لیکن اب تو وہ موقعے کی تلاش میں تھا۔ اس نے آلمبیر کے مقالے پر ایک سخت تنقیدی مضمون لکھ ڈالا۔ اس مضمون میں اس نے ثابت کر دیا تھا کہ در پردہ یہ خیالات والتیئر کے ہیں۔
یہ مقالہ جنیوا شہر پر لکھا گیا تھا۔ اس مقالے میں بظاہر پادریوں کی تعریف کی گئی تھی لیکن در پردہ مذاق اڑایا گیا تھا۔ پروٹسٹنٹ پادریوں کی تعریف کی گئی تھی کہ وہ موحد ہیں اور بائبل یا دوزخ پر ایمان نہیں رکھتے۔ روسو نے اپنے تنقیدی مضمون میں پادریوں کی توجہ اس طرف دلائی۔ اس کے ساتھ ہی روسو نے والتیئر کا ایک خط بھی چھاپ دیا۔ اس میں ایسی سخت اور بے لباس باتیں تھیں جو اس کے ملحد اور کافر ہونے کے لیے کافی تھیں۔
زلزلے کے موضوع پر لکھی ہوئی والتیئر کی نظم ابھی زیرِ غور تھی کہ یہ تحریریں سامنے آ گئیں۔ شہر کے پادریوں کا اجلاس ہوا جس میں اسے کافر و ملحد قرار دے دیا گیا۔ جنیوا کے کلیساؤں میں اس کے خلاف واعظ ہونے لگے۔ والتیئر نے اپنے دفاع میں کئی تاویلیں پیش کیں مگر اس کی آواز کلیساؤں میں دفن ہو گئی۔
روسو تک یہ خبر پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ والتیئر کو اپنا مکان فروخت کرنا پڑا۔ پادریوں نے اسے جنیوا چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور اب وہ سوئٹزر لینڈ کی سرحد کے قریب فرانس کے علاقے میں فاغنے کے مقام پر رہائش پذیر ہے۔
وہ ایک تیر سے کئی شکار کھیل چکا تھا لیکن اطمینان اب بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ سوفی کا خیال اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات ایک ایک کر کے اس کے سامنے آتے رہتے تھے۔ دوستوں سے تعلقات کشیدہ تھے۔ سوفی روٹھ گئی تھی۔ رہ رہ کر پیرس یاد آتا تھا لیکن وادی چھوڑ کر جانے کو جی بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ جاتا تو کہاں جاتا۔ پھول انگارے، درخت دشمن بن گئے تھے۔ وہ بہت دن سے سیر کے لیے بھی نہیں نکلا تھا۔ ایک دن اس نے ٹریزے کو ساتھ لیا اور وادی میں دور تک اترتا چلا گیا۔ ٹریزے خوش تھی کہ بہت دن بعد روسو اسے اپنے ساتھ سیر کے لیے لے کر نکلا ہے لیکن روسو بہت اداس تھا۔
"آپ اتنے سنجیدہ کیوں ہیں۔ بہت دن بعد تو ہم گھومنے نکلے ہیں۔"
"میں گھومنے نہیں آیا ہوں۔ ماضی کا شکار کرنے آیا ہوں، یادوں کے جگنو اپنی مٹھی میں بند کرنے آیا ہوں۔ ستارے قید کرنے خوشبو چرانے آیا ہوں۔"
وہ اپنی رو میں کہتا چلا گیا۔ ٹریزے ان باتوں کو کہاں سمجھنے والی تھی، پھٹی پھٹی آنکھوں سے روسو کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے تو یہ شک ہونے لگا کہ اس کے شوہر کا دماغ چل گیا ہے۔
دن بھر وہ ان جنگلوں میں آوارہ گردی کرتا رہا اور گھر لوٹ آیا۔ اس دن کے بعد سے یہ اس کا روز کا معمول بن گیا۔ کاغذ اور قلم اس کے پاس ہوتے۔ کبھی کبھی ذہن میں آنے والے خیالات نوٹ کر لیتا۔ ٹریزے خاموشی سے اس کے ساتھ چلتی رہتی۔ سہ پہر کو گھر لوٹنے پر وہ شوخ رنگ کے ربن میں بندھے ہوئے کاغذ کھولتا اور دن بھر کے خیالات اور جذبات درج کر لیتا۔
اس کی یہ سرگرمیاں پراسرار ہوتی جا رہی تھیں۔ ٹریزے کچھ سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ تو اس فکر میں دبلی ہوئی جا رہی تھی کہ شاید اس کا شوہر وادی کے درخت گننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس کی صحت کا خدا حافظ ہے۔
ایک دن یہ اعلان کر کے اس نے اس طلسم کو توڑ دیا کہ وہ ایک معرکتہ الآرا ناول لکھنے میں مشغول ہے۔ ٹریزے نے ایک گہری سانس لی یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ روسو پر اکثر یہ

دورے پڑتے رہتے تھے البتہ ٹریزے کو اب یہ فکر ہوگئی تھی کہ نہ جانے کتنے عرصے تک روسو اس کی طرف سے بے نیاز رہے گا۔ وہ جب بھی کچھ لکھنے بیٹھتا تھا تو اس کی طرف سے بالکل غافل ہو جاتا تھا۔

وہ اس ناول کو اپنے اور سوفی کے رومانس کے پس منظر میں لکھ رہا تھا۔ اس کا مقصد سچے عاشق کی تصویر کشی تھا۔ ناول کی ہیروئن ژولی نیک اطوار دوشیزہ ہے جو اپنے دل کی آواز کے سامنے عقل کی بات نہیں سنتی۔ اپنا سب کچھ اپنے محبوب پر نثار کرنے پر آمادہ ہے مگر ژولی کے عالی خاندان کو یہ گوارا نہیں ہے کہ ان کی بیٹی ایک معمولی گھرانے کے نوجوان کے ساتھ بیاہی جائے۔ ژولی کو اب دو صورتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا، یا وہ اپنے والدین کی دل دکھانے والی نافرمانی کرے یا اپنے محبوب سے جدا ہو جائے۔ ژولی نے دوسری صورت کا انتخاب کرلیا اور اس کی شادی والدین کی مرضی کے مطابق ایک اور شخص سے ہوگئی۔

یہ وہی واقعات تھے جو خود اس پر گزر گئے تھے۔ ژولی کے پردے میں خود اس کی محبوبہ سوفی بول رہی تھی۔ اس کے دل کا گداز اس کے ایک ایک لفظ سے ٹپک رہا تھا۔ فطری مناظر کی دل موہ لینے والی تصویر کشی روسو کے مزاج کا خاص حصہ تھا۔ یہ ناول محبت ناموں پر مشتمل تھا۔ ان محبت ناموں کو پرکشش بنانے کے لیے اس نے چند غیر ضروری واقعات اور کردار بھی شامل کر دیے تھے۔

روسو نے اس ناول کا نام ”نویل ایلواز“ رکھا اور 1760ء میں اسے شائع کرادیا۔ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی فرانس میں ایک ہلچل مچ گئی۔ جذباتی طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ خاص طور پر عورتیں اس ناول کی دیوانی ہوئی جارہی تھیں۔ اس کے مصنف پر مرنے لگی تھیں۔ اگر ان میں سے کسی کو اس کا جھوٹا پانی مل جاتا تو وہ اسے پینے کو اپنی خوش قسمتی کا عروج جانتی۔ چیخ چیخ کر دوسروں کو بتاتی کہ اس نے روسو کا جھوٹا پانی پیا ہے۔

اس ناول کی مقبولیت نے طرح طرح کے قصے مشہور کر دیے تھے۔ مشہور ہو گیا تھا کہ رقص و سرود کی محفلوں میں جانے کی تیاری کرنے والی مہذب اور شائستہ خواتین اس ناول میں کھو جاتی ہیں۔ آدھی آدھی رات تک وہ یہ ناول پڑھتی رہتی ہیں اور جب ان کو بتایا جاتا ہے کہ ان کو لے جانے کے لیے بگھی تیار ہے تو جواب میں زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالتیں۔ یہاں تک کہ گھوڑوں کو بگھی سے نکالنے کا حکم دے کر ناول کا بقیہ حصہ پڑھنے کے لیے بستر میں گھس جاتی ہیں۔

جرمنی کا عظیم فلسفی کانٹ وقت کا اس قدر پابند تھا کہ جب سیر کے لیے گھر سے نکلتا تو لوگ اس کو دیکھ کر گھڑیوں میں وقت ٹھیک کرلیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ برسوں سے جاری تھا مگر ایک روز کانٹ مقررہ وقت پر سیر کے لیے نہ نکل سکا۔ اس روز وہ روسو کا ناول پڑھ رہا تھا۔

مائیں اس ناول کو چھپا کر رکھتی تھیں۔ دوشیزائیں چھپ کر پڑھتی تھیں۔ کتاب کی مانگ کا یہ حال ہو گیا تھا کہ ناشر فرمائشیں پوری کرتے کرتے تھک گئے۔ درباری، سپاہی، وکیل سبھی اس ناول کے دیوانے ہو رہے تھے۔

ناول کی اشاعت اور مقبولیت کے بعد روسو کی شہرت اور خوش حالی کے دن اس کے دروازے پر قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے تھے لیکن خود اس کی صحت روز بہ روز گرتی جارہی تھی۔ صحت افزا علاقے میں قیام کے باوجود اس کی تکلیفیں دردناک ہوتی جارہی تھیں۔ عشق میں ناکامی، دوستوں سے جھگڑے اور جسمانی تکالیف نے اس کے شب و روز اذیت ناک بنا دیے تھے۔ اس کے باوجود وہ دو کتابوں پر بہ یک وقت کام کر رہا تھا۔ اس نے جب دیژون اکادمی کے لیے اپنا دوسرا مقالہ لکھا تھا تو چند سوال اس کے ذہن میں اٹھے تھے۔ اس نے یہ تو لکھ دیا تھا کہ لوگوں نے اپنی آزادی کے تحفظ کی خاطر سماجی نظام کو قبول کرلیا۔ اس کے نزدیک یہ ایک قسم کا معاہدہ تھا جس کی بنیاد ظلم اور بالادستی پر تھی لیکن سماجی معاہدے سے کیا مراد ہے اور یہ کس قسم کا ہونا چاہیے۔ اس سوال کا جواب باقی تھا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ اس سوال کا جواب دے۔ اس نے اپنے خیالات قلمبند کرنے شروع کر دیے۔ یہ کتاب ”معاہدہ عمرانی“ کے نام سے شائع ہوئی اور اپنے مصنف کا نام زندہ کر گئی۔

اس نے لکھا تھا ”چونکہ فطرت کے اعتبار سے ایک انسان کو دوسرے انسان پر حاکمیت روا نہیں اور چونکہ قوت حق کی بنیاد نہیں لہٰذا تمام جائز حاکمیت کی بنیاد عہد و پیمان یا سادہ لفظوں میں یوں کہیے کہ معاہدے قرار پاتے ہیں۔ اسی معاہدے کا نام عمرانی یا سماجی معاہدہ ہے۔“

وہ آزادی کو دنیا کی اہم ترین شے سمجھتا تھا اور کہتا تھا کہ آزادی انسان کو فطرت کی طرف سے تحفے میں ملی ہے اور انسانوں کو قانونی یا کسی اور جائز طریقے سے اس سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

معاہدہ عمرانی کے آخری حصے میں اس نے مذہب مدنی پر بحث کی تھی۔ اس کے نزدیک ایسے مذاہب ناپسندیدہ تھے جو

آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ سچائی ایک ہے۔ اعتراض یہ نہیں کہ مذہب کئی ہیں۔ اعتراض تب پیدا ہوتا ہے جب وہ نفرت اور تعصب پھیلاتے ہیں۔

یہ عجیب بات تھی کہ مسیحی زندگی گزارنے والا روسو معاہدہ عمرانی میں مسیحیت کو رد کر دیتا ہے اور الزام لگاتا ہے کہ یہ مذہب غلامی کی تعلیم دیتا ہے اور یہ کہ اس مذہب کے بنیادی اصول ظالموں اور جابروں کے لیے اس قدر مفید ہیں کہ وہ ہمیشہ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔

اس نے انسانی آزادی کا چرچا کیا اور جتلایا کہ فطرت نے انسانوں کو آزاد پیدا کیا ہے اور وہ اس کو آزاد ہی دیکھنا چاہتی ہے لیکن غاصب حکمرانوں نے اور انسان دشمن سماجی نظاموں نے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں اور اسے غلام بنالیا ہے۔

معاہدہ عمرانی کی اشاعت نے فرانس کے شہریوں میں ایک نیا ولولہ پیدا کیا اور وہ ذہن تیار کیا جو آئندہ چل کر انقلابِ فرانس کا پیش خیمہ بننے والا تھا۔

اس کتاب کے شائع ہوتے ہی زوردار بحثیں شروع ہوگئیں۔ اس کے حامی اور مخالفین دونوں میدان میں آگئے۔ ایک جانب کے انتہا پسند اس کتاب کو فرد کی آزادی کا منشور قرار دے رہے تھے تو دوسری طرف کے انتہا پسند اس کو شہریوں کی آزادی اور حقوق سے محروم کرنے والی آمریت کا دستور ٹھہرا رہے تھے۔ فرانس کے علاوہ براعظم یورپ کے دوسرے حصوں میں بھی یہ کتاب بحث و مباحثہ کا عنوان بن گئی۔

وہ ان مباحث سے بے نیاز ہوکر دوسری کتاب ''ایمیل'' لکھنے بیٹھ گیا۔ اس کتاب میں اسے اپنا تعلیمی نظام پیش کرنا تھا۔ یہ کتاب دراصل اس کے پہلے مقالے کی تکمیلی صورت تھا جو اس نے ویژون اکادمی کے لیے تحریر کیا تھا اور جس پر اسے انعام سے نوازا گیا تھا۔ اس مقالے میں اس نے دعویٰ کیا تھا کہ انسان اور اشیا اپنی اصلی حالت میں اچھی تھیں لیکن تہذیب و تمدن کے تقاضوں نے ان کو بگاڑ دیا ہے۔ اب لازمی طور پر اسے دنیا کو یہ بتانا تھا کہ تہذیب کاری کے اس خراب کرنے والے عمل کو کس طرح کم کیا جاسکتا ہے۔ تعلیم کے موضوع پر کتاب لکھ کر اس نے یہی فرض ادا کیا۔

اس کا زمانہ امید پرستی کا زمانہ تھا۔ ہر کوئی یہ سوال پوچھ رہا تھا کہ مستقبل کی بہتر صورت گری کس طرح کی جاسکتی ہے۔ اس صورتِ حال میں تعلیم کی اہمیت اچانک بڑھ گئی تھی۔ تعلیم کے موضوع پر روسو کے غور و فکر کے نتائج ''ایمیل'' کی صورت میں سامنے آئے۔

روسو سے پہلے اٹھارھویں صدی کے مفکر جب فرانس اور یورپ کے دوسرے حصوں میں تعلیم کا چرچا کرتے تھے تو پیشِ نظر صرف امیر طبقوں کے نوجوان کی تعلیم ہوا کرتی تھی۔ روسو نے پہلی مرتبہ تعلیم کو ایسا عمل قرار دیا جس کا تعلق امرا اور خوش حال طبقات کے ساتھ ساتھ غریب اور محروم طبقوں سے بھی ہے۔ اس کے ان خیالات سے لوگوں نے بجا طور پر نتیجہ اخذ کیا کہ اس قسم کی اہلیت صرف امیروں کے بچوں تک محدود نہیں۔ یہ تمام انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ اور تمام لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اس نے اس کتاب میں یہ دعویٰ بھی کیا کہ فلسفی اور ماہرینِ تعلیم (اس کے زمانے کے) بچپن کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ بچوں کی ایک خاص ذہنیت ہوتی ہے اور تعلیم کے شعبے میں پہلا کام ان کی ذہنیت کو سمجھنا ہوتا ہے۔ روسو اس اعتبار سے پہلا مفکر تھا جس نے تدریس کے علم کو سائنسی انداز میں بچے کے ذہن کا تجزیہ کرنے سے منسلک کر دیا یہ بھی لوگوں کے لیے ایک جدید ترین بات تھی۔

اس کتاب کے بنیادی موضوعات کا تعلق مذہب سے نہیں تھا لیکن برسبیلِ تذکرہ اس نے اس کتاب کے ایک حصے میں مذہب کو بھی موضوع بنایا۔ وہ اپنے دور کے بیشتر فلاسفر کی طرح الحاد کی طرف مائل نہ تھا۔ اس نے بڑے خلوص سے مذہبی بحث چھیڑی تھی۔ اس کے باوجود احتسابی اداروں کو اس کی یہ ادا پسند نہ آئی۔ کلیسا کے اداروں نے اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ وہ ہر اس تحریر کو ناپسند کرتے تھے جس میں کوئی نیا خیال پیش کیا گیا ہو یا تمام لوگوں کے ساتھ انصاف کرنے یا معاشی اصلاحات کی بات کی گئی ہو۔ پیرس میں آئے دن ایسی کتابیں سرِعام جلائی جاتی تھیں۔ روسو بھی اپنی صاف گوئی سے ان کا نشانہ بن گیا۔ ابھی کتاب کو شائع ہوئے چند روز ہی گزرے تھے کہ پیرس کی پارلیمنٹ نے کتاب کو نذرِ آتش کرنے اور مصنف کو گرفتار کرنے کا حکم جاری کر دیا۔

☆☆☆

8 جون 1762ء کا دن اس نے دو دوستوں کے ساتھ ہنسی خوشی گزارا۔ دن بھر وہ اپنے دوستوں کی زبانی اپنی کامرانی کے قصے سنتا اور خوش ہوتا رہا۔ ٹریزے اس کے دوستوں کی خدمت میں مصروف رہی۔

رات ہوئی اور وہ مطالعہ کرنے بیٹھ گیا۔ وہ رات کے آخری حصے میں عموماً بائبل کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ جب نیند آنکھوں کی کھڑکیوں میں آکر بیٹھ جاتی تو وہ چراغ گل کرتا

اور سونے کے لیے لیٹ جاتا لیکن اس دن اس کی نیند اس سے روٹھ گئی تھی۔ وہ پڑھتا چلا گیا۔ بائبل کا پورا حصہ پڑھ ڈالا۔ نیند اب بھی روٹھی ہوئی تھی اس نے بائبل کو سرہانے رکھا اور روٹھی ہوئی نیند کو منانے کے لیے زبردستی آنکھیں بند کرلیں۔ وہ دل ہی دل میں بائبل کی عبارتوں کو دہرا رہا تھا۔ کبھی اسے احساس ہوتا کہ وہ سو گیا ہے اور دھندلے دھندلے خواب دیکھ رہا ہے کبھی اسے محسوس ہوتا کہ وہ بیدار ہے۔ اسی خواب و نیم خوابی میں اس نے دیکھا کہ اچانک روشنی ہوگئی۔ اس نے سوچا آسمانی نور، عالم خواب میں اس کے سرہانے آکر کھڑا ہوگیا ہے۔ پھر کوئی اسے آوازیں دینے لگا۔ کیا فرشتے بھی آگئے؟ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ ایک شخص اس کے کمرے میں موجود تھا ٹریزے اس آدمی کے پیچھے سہمی ہوئی کھڑی تھی۔

”کون ہو تم اور اس وقت؟ میری خواب گاہ میں؟“ روسو نے بستر سے نکلتے ہوئے اس آدمی کو للکارا۔

”گھبراؤ نہیں۔ مجھے مادام دے لکسمبرگ نے ایک خاص پیغام دے کر آپ کے پاس بھیجا ہے۔“

مادام اس کی دوست تھی۔ اس کا نام سن کر وہ دوبارہ بستر پر بیٹھ گیا۔ ”اس وقت کسی پیغام کا کیا مطلب سب کچھ ٹھیک ٹھاک تو ہے؟“

”میں آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ اس شخص نے ٹریزے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

روسو نے ٹریزے کو باہر بھیج دیا۔ کمرے میں مکمل خاموشی ہوگئی۔ دور سے ٹریزے کی ماں کی آواز آرہی تھی جو غالباً اس صورتِ حال میں بہت زیادہ گھبرا گئی تھی اور چیخ چیخ کر ٹریزے سے کچھ پوچھ رہی تھی۔

”آپ کی جان کو خطرہ ہے۔“ اس شخص نے کہنا شروع کیا ”پیرس کی پارلیمنٹ نے آپ کی کتاب ”ایمیل“ کو نذرِ آتش کرنے اور آپ کی گرفتاری کے احکام صادر کردیے ہیں۔“

”مگر کیوں؟ میں نے تو سنسر شپ کے ادارے کے سربراہ سے اس کتاب کی اشاعت کا اجازت نامہ حاصل کرلیا تھا۔“

”اس کے باوجود یہ احکام صادر ہوئے ہیں۔ مادام کو قبل از وقت اس فیصلے کا علم ہوگیا ہے۔ صبح تک اس پر عمل درآمد شروع ہوجائے گا۔ ممکن ہے آپ کی گرفتاری آج رات ہی عمل میں آجائے۔ مادام نے پیغام بھجوایا ہے کہ آپ گرفتاری سے بچنے کے لیے فوراً کہیں بھاگ جائیں۔“

روسو نے گھبرا کر گھڑی کی طرف دیکھا، اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ وہ صبح ہونے کا انتظار نہیں کرسکتا تھا وہ جانتا تھا کہ یہاں فیصلوں پر عمل درآمد کتنی جلدی ہوتا ہے۔ ممکن ہے مجھے سورج دیکھنا نصیب نہ ہو۔ اس نے پیغام بر کو رخصت کیا۔ ٹریزے کو وہیں چھوڑا اور رات کے اندھیرے کو چیرتا ہوا پیدل ہی کسی طرف روانہ ہوگیا۔ 14 جون کو وہ برن کے علاقے میں پہنچ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے وطن جنیوا میں پناہ لے لے گا۔

ابھی وہ تھکن بھی اتارنے نہیں پایا تھا کہ جنیوا سے خبر آگئی کہ وہاں بھی ”ایمیل“ اور ”معاہدہ عمرانی“ کی جلدوں کو نذرِ آتش کردیا گیا ہے اور اس کی گرفتاری کے احکام صادر ہوچکے ہیں۔ اب وہاں جانا موت کو دعوت دینا تھا۔ اسے برن ہی میں ٹھہرنا پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ یہیں کہیں روپوش ہوجائے گا لیکن زمین اس پر تنگ ہوتی جارہی تھی۔ حکام نے اسے برن سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ اسے ایک مرتبہ پھر بھاگنا پڑا اور پروشیا کی ریاست نیوشیٹل پہنچ گیا۔ یہ ریاست فریڈرک اعظم کے ماتحت تھی۔ یہ وہی بادشاہ تھا جس کی مخالفت مول لے کر اس کا ایک ہم عصر فلسفی والتیئر پناہ کی تلاش میں بھاگتا پھر رہا تھا۔ آج قسمت اسے اسی بادشاہ کے دروازے پر لے آئی تھی۔ اسے خوشی تھی تو اتنی کہ اب فرانس سے باہر نکل آیا ہے۔

نیوشیٹل پہنچتے ہی روسو کو اپنی ایک نظم یاد آگئی۔ جو اس نے فریڈرک اعظم کے خلاف لکھی تھی جس میں اس نے لکھا تھا ”فریڈرک فلسفیوں کی طرح سوچتا ہے اور بادشاہوں کی طرح عمل کرتا ہے“ اپنی کتاب ”ایمیل“ میں بھی اس نے فریڈرک کا علامتی انداز میں ذکر کیا تھا جو سراسر منفی تھا۔ اس وقت اسے کیا معلوم تھا کہ کبھی اسی بادشاہ کے علاقے میں اسے پناہ کی ضرورت پڑے گی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا کیا جائے۔ فریڈرک اس کے خیالات سے غافل نہیں ہوگا۔ وہ اس کی گرفتاری کے حکام صادر کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ پہلے اس نے سوچا وہ یہاں سے نکل جائے لیکن پھر کچھ سوچ کر لکھنے بیٹھ گیا۔ اس نے ایک خط علاقے کے گورنر کے نام لکھا جس میں اپنی آمد کی اطلاع دی قیام کی اجازت مانگی۔ دوسرا خط فریڈرک اعظم کے نام لکھا۔

”میں آپ کے خلاف بہت کچھ کہتا رہا ہوں اور شاید آئندہ بھی کہتا رہوں۔ پھر بھی فرانس، جنیوا اور برن کے دروازے بند ہوجانے کے بعد میں پناہ کی تلاش میں آپ کی سلطنت میں آنکلا ہوں۔

جناب! میں آپ کی طرف سے کسی عنایت کا مستحق نہیں لیکن مجھے کسی مہربان کی جستجو بھی نہیں۔ بس میں نے اپنا فرض سمجھا کہ عزت مآب کو مطلع کر دوں کہ میں آپ کے قبضے میں ہوں اور آپ جو چاہیں میرے ساتھ سلوک کر سکتے ہیں۔''

اس کی یہ دانش مندی اور صاف گوئی اس کے کام آ گئی۔ بادشاہ فریڈرک اسے اور اس کی تحریروں کو قطعی پسند نہ کرتا تھا لیکن اس خط نے اس پر اتنا اثر کیا کہ اس نے نیوشیٹل کے گورنر کو فوراً ہدایت کی کہ نہ صرف یہ کہ روسو کو قیام کی اجازت دے دی جائے بلکہ اسے زندگی کی چھوٹی موٹی ضروریات بھی مہیا کر دی جائیں۔

روسو خط لکھ کر اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کر رہا تھا کہ علاقے کے گورنر نے اسے طلب کر لیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ فیصلہ اس کے حق میں ہوا ہے ورنہ وہ بلایا نہیں جاتا بلکہ گرفتار کر کے لے جایا جاتا۔ گورنر نے اسے عزت و تکریم کے ساتھ بٹھایا اور بادشاہ کا فرمان پڑھ کر سنایا جس میں اسے اجازت دی گئی کہ وہ جب تک چاہے اس ریاست میں آزاد زندگی گزار سکتا ہے۔

''آپ اگر چاہیں تو میں بادشاہ کی ہدایت کے مطابق زندگی کی کچھ آسائشیں فراہم کر سکتا ہوں۔ آپ اپنی ضروریات سے مجھے آگاہ کر سکتے ہیں تاکہ میں فہرست بادشاہ تک پہنچا دوں۔'' گورنر نے کہا۔

''جناب! میرے پاس دو۔۔ تین سال تک زندہ رہنے کے لیے وسائل موجود ہیں، میں آپ کے بادشاہ سلامت کی کوئی خدمت تو کرتا نہیں ہوں۔ اس لیے اگر بھوک سے مرنے لگوں تو بھی ان سے روٹی کا ایک لقمہ قبول کرنے کے بجائے گھاس کھانے کو ترجیح دوں گا۔''

اس نے اپنی کتاب ''ایمیل'' کی بے پناہ اشاعت پر اچھی خاصی دولت کمائی تھی لیکن اس کی لالچی ساس اس کی جیب خالی کراتی رہی تھی۔ مونٹ مورلسی کے اخراجات بھی کم نہیں تھے کئی مہینوں سے وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگتا پھر رہا تھا۔ اب مفلوک الحال تھا لیکن اس کی خودداری نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ فریڈرک اعظم کی امداد قبول کرتا۔

نیوشیٹل میں اس کے لیے ماحول سازگار نہیں تھا لیکن جنیوا جانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ شہر کے حاکموں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس نے اس کا دل توڑ دیا تھا۔ اس نے اپنے محبوب شہر کی شہریت باقاعدہ طور پر تیاگ دی اور نیوشیٹل میں مستقل رہنے کا ارادہ کر لیا۔ اس فیصلے کے بعد اس نے ٹریزے کو اپنے پاس بلا لیا۔

ٹریزے بڑے اشتیاق سے نیوشیٹل آئی تھی۔ روسو سے بچھڑے ہوئے اسے بہت دن ہو گئے تھے۔ جب ملی تو رو رو کے آنسوؤں کے دریا بہا دیئے۔ روسو کو اس کی یہی سادہ لوحی پسند تھی۔

روسو کو یقین تھا کہ غربت کے باوجود اب اس شہر میں اس کا دل لگ جائے گا۔ اس کی ٹریزے اس کے ساتھ ہے اور کیا چاہئے اور واقعی اس کا دل لگ بھی گیا لیکن ٹریزے یہاں کی تنہائی سے بہت جلد بیزار ہو گئی۔ وہ اپنا غصہ روسو پر اتارنے لگی۔ ان کی گھریلو زندگی اس سے پہلے اتنی تلخ کبھی نہیں ہوئی تھی جتنی اب ہو گئی تھی۔

''میں یہاں آکر گونگی بن گئی ہوں نہ میں کسی کی بات سمجھتی ہوں نہ کوئی میری زبان سمجھتا ہے۔ لوگ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتے ہیں۔''

''تم ابھی سے کیوں تنگ آ گئیں۔ کچھ دن میں یہاں کی زبان بھی سیکھ لوگی۔''

''کیا مطلب؟ کیا اس جہنم میں ہمیں ہمیشہ رہنا ہے۔''

''جس شہر نے مجھے پناہ دی تم اسے جہنم کہتی ہو۔''

''پناہ ہمیں کہیں اور بھی مل سکتی ہے۔''

''بس ذرا صبر کر لو۔ جیسے ہی کوئی جائے پناہ ملی میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔''

اس قسم کے جھگڑے روز ہی ہوتے تھے۔ روسو اسے دلاسے دیتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی اسے لے کر سیر کے لیے نکل جاتا تاکہ اس کا دل بہلا رہے لیکن اب ٹریزے بہت بوجھل دل کے ساتھ اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔

شہر کے لوگوں کو نہ جانے کیسے یہ علم ہو گیا کہ ٹریزے روسو کی باقاعدہ بیوی نہیں۔ وہ نکاح کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ یہ کوئی معمولی خبر نہیں تھی اب تو آس پاس کے لوگ بالکل ہی منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے ــــ وہ دونوں ساتھ نکلتے تو لوگ اشارے کرتے نفرت سے زمین پر تھوک دیتے۔

اب تک تو ٹریزے بے زار تھی۔ اب روسو بھی یہاں سے اکتانے لگا تھا لیکن ابھی وہ یہاں سے نکلنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بے زاری کے باوجود یہاں کچھ دن اور رہ سکتا تھا لیکن ایک واقعہ نے اسے چوکنا کر دیا۔ ایک روز وہ اپنے کمرے میں بیٹھا مطالعے میں مصروف تھا کہ ٹریزے بھاگتی ہوئی آئی۔

''کچھ لوگ ہمارے گھر کے سامنے جمع ہیں ان میں سے کچھ نے پتھر بھی اچھالے ہیں۔ یہ پتھر کھڑکی سے کمرے کے

اندر آئے ہیں۔ میں کھڑکی سے ہٹ کر بیٹھی ہوئی تھی ورنہ زخمی ہوگئی ہوتی۔"

"تمہیں وہم ہوا ہوگا۔ جاؤ جاکر سو جاؤ۔"

"کیا یہ بھی وہم ہے کہ کمرے میں پتھر ابھی تک پڑے ہوئے ہیں۔"

روسو اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں گیا کچھ پتھر واقعی پڑے ہوئے تھے۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا گلی میں سناٹا تھا۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔" روسو نے کہا۔

"تم کیا سمجھتے ہو وہ یہیں رہیں گے' بھاگ گئے ہوں گے۔ وہ تو بس ہمیں خوف زدہ کرنا چاہتے ہیں۔"

"انہیں شاید یہ خبر نہیں کہ میں خوف زدہ ہونے والا نہیں۔"

روسو نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا کہ وہ خوف زدہ ہونے والا نہیں ہے لیکن حقیقت میں وہ ڈر گیا تھا۔ اس نے کسی کو پتھر پھینکتے ہوئے خود نہیں دیکھا تھا۔

یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ ٹریزے نے اسے ڈرانے کے لیے یہ کہانی گھڑ دی ہوتا کہ وہ خوف زدہ ہوجائے اور اسے لے کر نیوشٹیل سے نکل جائے۔ اگر یہ ترکیب اس کی تھی تو وہ کامیاب ہوگئی۔ روسو نے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اسے یقین آگیا کہ نیوشٹیل کے لوگ اسے اور ٹریزے کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ اس نے ٹریزے کو ساتھ لیا اور ایک خوبصورت سے جزیرے پر پہنچ گیا۔ یہ جزیرہ فطرت سے اتنا قریب تر تھا کہ روسو چند دن بعد میں یہ خیال کرنے لگا کہ وہ ویسی ہی جنگلی زندگی گزار رہا ہے جیسے کہ فطری زندگی ہوا کرتی ہے۔ جزیرے پر ہر طرف نباتات کے ہجوم تھے۔ ہزار ہا اقسام کی جڑی بوٹیاں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ دن بھر ان پودوں کا معائنہ کرتا رہتا۔ یہاں اس کی ملاقات ایک خاتون مادام بوفلرز سے ہوئی جو اس کی طرح نباتات کی دیوانی تھی اور پودوں کے مطالعے کے لیے جزیرے پر آئی ہوئی تھی۔ وہ دونوں دن بھر پودوں کا تعاقب کرتے رہتے اور شام کو بیٹھ کر اپنے اپنے نتائج کا تبادلہ کرتے۔

ابھی اسے اس جزیرے پر آئے ہوئے چند ہفتے ہوئے تھے کہ دی بوفلرز کی زبانی اسے ممتاز انگریز فلسفی ڈیوڈ ہیوم کا پیغام ملا۔ ڈیوڈ ہیوم نے اسے اس کی پریشانیوں سے نجات دلانے کے لیے انگلستان آنے کی دعوت دی تھی۔ یہ اس کے لیے بارش کی دھوپ کی طرح دل خوش کن خبر تھی لیکن وہ کچھ دیر سوچنا چاہتا تھا۔ اس نے ڈیوڈ ہیوم کو شکر گزاری کا خط لکھا اور کچھ دن کی مہلت مانگ لی۔

وہ ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ دسمبر 1765ء میں اس کو پیرس واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ پیرس کی یاد نے ایسا بے خود کیا کہ وہ ہیوم کی پیش کش بھلا کر پیرس پہنچ گیا۔

پیرس پہنچنے کے بعد بھی ہیوم سے اس کی خط و کتابت جاری رہی۔ ڈیوڈ ہیوم اسے ہر خط میں انگلستان کی سنہری زندگی سے آشنا کرتا رہا۔ ان خطوط سے اسے معلوم ہوا کہ انگریزوں کے ملک میں سب لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ جس کا جو جی چاہتا ہے' عقیدہ رکھتا ہے لوگ ایک دوسرے کے عقیدوں میں دخل نہیں دیتے۔ اختلاف کے باعث وہ ایک دوسرے کے گلے نہیں کاٹتے بلکہ احترام کرتے ہیں اسے ان خطوط سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہاں سے اسے لکھنے اور بولنے کی آزادی حاصل ہوجائے گی۔

وہ جب پیرس کی سڑکوں سے گزرتا تو اسے اپنی کتابوں کا نذر آتش ہونا یاد آجاتا۔ قدم قدم پر اپنے لکھے ہوئے صفحات کی راکھ پڑی ہوئی نظر آتی۔ یہ نامراد شہر کسی کی محنت کا صلہ نہیں دیتا۔ یہاں ان لوگوں نے میری کتابوں کے خلاف آواز بلند کی جو ان کتابوں کو پڑھنے کی بھی اہلیت نہیں رکھتے۔ اگر آج مجھے پیرس میں رہنے کی اجازت مل گئی ہے تو کل پھر نکالا جاسکتا ہے۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا کہ وہ ڈیوڈ ہیوم کی پیش کش قبول کرلے گا۔ ہیوم کے ذریعے اسے اعلیٰ سوسائٹی تک رسائی حاصل ہوجائے گی اور زندگی مزے میں کٹ جائے گی۔ چنانچہ اس نے پیرس کو خیر باد کہہ دیا۔ ایک ایسے شہر کو ایسے وقت خیر باد کہہ دیا جب پورا یورپ اس کے نام کا دیوانہ تھا۔ اس کی شہرت کے سامنے والٹیئر کا نام بھی دھندلا گیا تھا۔ یہ شہرت اس نے برسوں کی تگ ودو کے بعد حاصل کی تھی اور ہفتوں میں اس شہرت کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اسے یہ سہولت بھی مل گئی تھی کہ ہیوم خود اسے لینے پیرس آگیا تھا۔

1766ء کے پہلے ہفتے میں وہ دونوں فرانس سے نکلے اور بارہ گھنٹے کے سمندری سفر کے بعد انگلستان کی بندرگاہ ڈوور جا پہنچے۔ 13 جنوری کو وہ دونوں لندن پہنچے۔ روسو پہلی بار لندن آیا تھا۔ شہر کے لوگوں نے خوشی سے اس کا استقبال کیا۔ شاید یہ خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی کہ یورپ کا عظیم فلسفی لندن پہنچ رہا ہے۔ لوگ اسے دیکھنے کے لیے سڑک پر امڈ آئے تھے۔

ہیوم نے اسٹارفورڈ شائر میں ووٹون کے مقام پر ایک شخص کے گھر میں اس کے قیام کا بندوبست کیا تھا۔ پرستاروں کا ہجوم جلوس کی شکل میں اسے اس مکان تک لے کر آیا۔ ڈیوڈ نے شہریوں کا شکریہ ادا کیا اور روسو کو مکان کے اندر لے گیا۔

یہ مکان روسو کے شایانِ شان تھا۔ وہ نہایت سادہ زندگی گزارنے کا عادی تھا لیکن اس مکان میں رکھا ہوا ساز و سامان انگریزوں کے اعلیٰ ذوق کی ترجمانی کر رہا تھا۔ روسو نے مجبوری سمجھ کر اسے قبول لیا۔

ابھی ایک دن بھی نہیں گزرا تھا کہ اس کی عظمت کے ترانے گونجنے لگے۔ بادشاہ جارج سوم نے اسے پناہ دینے کا فرمان جاری کیا اور وظیفہ دینے کا اعلان کیا۔ ہیوم خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اس نے دور دراز کے دوستوں کو خطوط لکھ کر روسو کی لندن آمد کی اطلاع کی اور اس کی تعریفوں میں زمین آسمان ایک کر دیے۔

''میں روسو سے بہت محبت کرتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہ بھی میرے بارے میں ایسے ہی احساسات رکھتا ہے۔ میں نے زندگی میں اس قدر منکسر المزاج، نرم خو، شائستہ اور گرم جوش شخص نہیں دیکھا۔ دیکھنے میں بھی وہ دوست نظر آتا ہے مجھے کبھی ایسے شخص سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا جو اچھی رفاقت کے لیے اس سے زیادہ موزوں ہو۔''

ایک اور خط اس نے لکھا ''لوگ کہتے تھے جھگڑے کے بغیر تم ایک دن بھی نہ رہ پاؤ گے لیکن میں تو سمجھتا ہوں کہ پوری زندگی اس کے ساتھ دوستی اور احترام کے رشتے میں بسر کر سکتا ہوں۔ میرے نزدیک ہمارے باہمی اخلاص کی بنیاد یہ ہے کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی جھگڑالو نہیں۔''

حکومت کے اعلیٰ عہدے دار اس سے ملاقاتوں کو اپنی خوش قسمتی تصور کرنے لگے۔ مشہور سیاست داں برک تو اس کا ایسا مداح ہوا تھا کہ بلا ناغہ اس سے ملنے اس کے گھر آتا تھا۔ امراء رؤسا سب اسے ہاتھوں ہاتھ لیے پھر رہے تھے۔ آزاد خیال اور روشن دماغوں کے اس شہر نے بہت جلد اسے قبول کر لیا تھا۔ لندن کی ہر تفریح گاہ کے دروازے اس پر کھلے ہوئے تھے۔ وہ کچھ دن تو ان روشنیوں میں اپنا سراپا دیکھتا رہا لیکن پھر اپنی عادت کے مطابق بے زار بھی ہوگیا۔ وہ کھلے بندوں کہنے لگا کہ گپ بازی، رنگ رلیوں اور وقت کی بربادی میں یہ شہر یورپ کے دوسرے شہروں سے کم نہیں۔

کچھ دن بعد ٹریزے اس سے آملی تھی۔ اس کے آتے ہی روسو کی زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آگیا تھا۔ گھر میں ایک لیڈی کے آجانے کے بعد اس کے مہذب دوست اور زیادہ مہذب ہوگئے تھے۔ مکان میں ہر وقت دوستوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ رات گئے تک وہ ان دوستوں سے خوش گپیوں میں مشغول رہتا اور پھر اپنی عادت کے مطابق مطالعے میں مصروف ہو جاتا۔ ٹریزے عضوِ معطل بنی ہوئی تھی، وہ بہت جلد اس تنہائی سے اکتانے لگی۔ وہ پڑھی لکھی بھی نہیں تھی کہ روسو اسے محفلوں میں ساتھ لے جاتا۔ اکیلے پن نے اسے بہت جلد چڑچڑا بنا دیا۔ گھر میں اسی طرح جھگڑے شروع ہوگئے جیسے کبھی نیوشیٹل کے قیام میں ہوا کرتے تھے۔ ٹریزے کبھی کبھی تو اتنے غصے میں آجاتی کہ اس کے دوستوں کی پروا بھی نہ کرتی۔ دوسروں کے سامنے اسے برا بھلا کہنے پر اتر آتی۔ جھگڑے کی یہ داستانیں گھر سے باہر بھی پہنچنے لگیں اور ان حالات میں روسو شدید ذہنی دباؤ کا شکار رہنے لگا تھا۔

زندگی کے مسائل کی گتھیاں سلجھانے والا گھر کے دھاگوں میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ ٹریزے کا رویہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا لیکن نجات کا راستہ بھی نہیں تھا۔ وہ اس سے تنگ بھی تھا اور اسے چھوڑنے پر تیار بھی نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ وہ نفسیاتی توازن سے محروم ہوگیا۔ وسوسے اور اندیشے اس کثرت سے حملہ آور ہوئے کہ وہ وہم کے مرض میں مبتلا ہوگیا۔ پوری دنیا ٹریزے کے روپ میں ڈھل گئی۔ وہ اس وہم میں مبتلا ہوگیا کہ ہر شخص اسے تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ظاہر ہے اس کے اس مرض کا نشانہ اس کے دوستوں کو بننا پڑ رہا تھا۔

ہیوم، جنیوا کے سرجن ٹرونچن کے بیٹے کے ساتھ رہتا تھا۔ روسو اس کو اپنا جانی دشمن سمجھتا تھا لہٰذا اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ہیوم اس کے دشمن سے ساز باز کر کے اسے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ ابھی اندر ہی اندر سلگ رہا تھا کہ انگلستان کے اخباروں میں اس کے خلاف ایک طنزیہ خط شائع ہوا۔ اس میں بعض ایسی باتیں شائع ہوئیں جو روسو کا خیال تھا کہ صرف ہیوم کے علم میں تھیں۔ اسے یقین آگیا کہ ہیوم اس کے دشمن کی باتوں میں آکر اس کے پیچھے لگ گیا ہے۔ وہم نے جڑیں پکڑ لیں۔ وہ ہیوم پر گہری نظر رکھنے لگا۔ ایک دن وہ گھر پہنچا تو اس کے تمام خطوط کھلے پڑے تھے۔ ٹریزے نے بتایا کہ اس کی غیر موجودگی میں ہیوم آیا تھا۔ یہ حرکت اس کی ہوگی۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ ٹریزے نے یا کسی اور نے ان خطوط کو کھولا ہو یا روسو خود ہی انہیں کھول کر بھول گیا ہو۔ اس کی ذہنی حالت سے کچھ بعید نہیں تھا۔ اس نے کسی تحقیق کے بغیر ہیوم کو مجرم سمجھ لیا۔ اس نے ہیوم سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ وہ گھر میں ہوتا بھی تو اس سے ملنے سے انکار کر دیتا۔ جب ہیوم نے اس کا یہ رویہ دیکھا تو وہ بھی اس سے کھنچنے لگا۔ کچھ دوستوں نے اس دوری کو محسوس کیا اور ہیوم سے سوالات کیے تو اس نے روسو کے بارے میں کچھ غیر ذمے دارانہ باتیں کیں۔ یہ باتیں روسو تک بھی پہنچیں۔ کچھ لوگوں نے اس صورتِ حال کو مزید ہوا دی۔ روسو

ہیوم کو اپنا دشمن سمجھنے لگا تھا۔ جواب میں وہ بھی ہیوم کے خلاف زہر اگلنے لگا اور یہ باتیں ہیوم تک بھی پہنچیں۔

جوابات کا یہ تبادلہ ہو ہی رہا تھا کہ ایک اخبار میں روسو اور ہیوم کی تصویریں ساتھ ساتھ شائع ہوئیں۔ روسو نے تعصب کی عینک لگا کر ان تصویروں کو دیکھا اور بھڑک اٹھا۔ روسو کہتا تھا یہ تصویریں خود ہیوم نے لگوائی ہیں۔ اس میں ہیوم تو آسمانی مخلوق کی طرح حسین نظر آرہا ہے اور میری تصویر ایسی بنوائی ہے جیسے کوئی ریچھ ہو۔

پے در پے ہونے والے ان واقعات نے اس کی ذہنی حالت ایسی بنادی کہ ہر معاملہ دوستوں کی سازش کا نتیجہ نظر آنے لگا۔ وہ یہاں تک سوچنے لگا کہ شاید انگلستان کی حکومت بھی اس کے خلاف سازش میں شریک ہو چکی ہے۔

یہ وہم اتنا بڑھا کہ اسے ہر شخص اس کے خلاف سازش کرتا نظر آنے لگا اور اس سازش کا سرغنہ اس کے نزدیک ہیوم تھا۔ یہ خیال اتنا پختہ ہوگیا کہ ایک دن وہ ہیوم سے الجھ پڑا۔ ہیوم نے بھی اسے بے نقط سنا ڈالیں۔ ہیوم کو یہ گھمنڈ تھا کہ اس نے روسو پر احسان کیے ہیں اور اب وہ نمک حرامی کر رہا ہے۔ اس نے اس جھگڑے کو ختم کرنے کے بجائے طول دینے کی ٹھان لی۔ وہ اب تک روسو کے خلاف تھا یا نہیں لیکن اب ضرور خلاف ہوگیا۔ اس نے روسو کے خلاف مخالفانہ مہم شروع کردی۔ تمام دوستوں کو خطوط لکھے جن میں روسو کے خلاف نازیبا باتیں درج تھیں۔ کل کا دوست آج کا دشمن بنا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے روسو کو خطوط لکھنے شروع کردیے۔ ان خطوط میں اس سے ہمدردی کے بجائے اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ روسو کی حالت یہ ہوگئی کہ غصے میں اپنے بال نوچنے لگا۔ ٹریزے اس کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھ رہی تھی لیکن بڑوں کی لڑائی میں اسے بولنے کا حق کہاں تھا۔ روسو بھی اسے اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ اس سے مشورہ لیتا۔ وہ اپنی آگ میں خود ہی جلتا چلا گیا۔ وہ ان حالات سے گھبرا کر اپنی سوانح ''اعترافات'' لکھنے بیٹھ گیا۔ وہ بڑی بے دردی سے اپنے بارے میں سچ اگل رہا تھا لیکن دوسروں کے بارے میں ایسے ایسے سچ لکھ رہا تھا کہ شائع ہوتے ہی سنسنی پھیلنا لازمی تھی۔

روسو اور ہیوم کا جھگڑا عروج پر تھا۔ کہانیاں اخباروں میں چھپ رہی تھیں۔ پوسٹر اور پمفلٹ شائع ہو رہے تھے، لوگ اس تماشے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس کی ذہنی طبیعت کے پیشِ نظر سب نے اسے چھوڑ دیا تھا جبکہ ہیوم کے ساتھ دوستوں کا ہجوم تھا۔ روسو کو ہر محاذ پر شکست ہوتی چلی گئی۔ فرانس میں تو اس کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہوا تھا جو لندن میں ہو رہا تھا۔

برف باری کے دن شروع ہوئے تو وہ گھر میں بند ہونے پر مجبور ہوگیا۔ ذہنی الجھنیں بڑھنے لگیں۔ اب اسے یہ وہم کھائے جا رہا تھا کہ میں تو گھر میں بند ہوں، باہر میرے خلاف سازشیں ہو رہی ہوں گی۔ دوستوں کو خوب موقع مل رہا ہوگا۔ ایک روز گھر میں کام کرنے والی نوکرانی سے ٹریزے کا جھگڑا ہوگیا۔ بس پھر کیا تھا۔ اسے یقین ہوگیا کہ پوری انگریز قوم اس کے خلاف ہوگئی ہے۔ اس نے سوچا وہ کس کس سے لڑے گا۔ اس سے بہتر ہے دشمن کے سامنے سے ہٹ جائے۔

جب خوف اور اندیشے اس کی برداشت کے حدوں کو پھلانگنے لگے تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے گھر سے بھاگ گیا۔ دس پندرہ دن تک اس کی کوئی خبر نہ ملی۔ ہمدرد پریشان تھے کہ کہیں خودکشی نہ کرلی ہو۔

ڈیون پورٹ، جس کے مکان میں روسو کو ٹھہرایا گیا تھا سخت پریشان تھا کہ کہیں اس پر کوئی الزام نہ آجائے۔ وہ اِدھر اُدھر ڈھونڈتا پھر رہا تھا کہ کہیں سے اس کا کوئی سراغ مل جائے۔ آخر ایک روز روسو کا ایک خط اسے موصول ہوا۔ ڈیوڈ نے اپنے ایک ملازم کو فوراً بلایا۔

''مسٹر روسو لنکن شائر میں ہیں۔ ہمارے مہمان ہیں ہم سے ناراض ہوکر چلے گئے ہیں۔''

''وہ تو سب سے ہی ناراض ہیں۔''

''وہ بیمار بھی ہیں ہم لوگ ان کی بیماری کا خیال بھی نہیں کرتے۔ تم فوراً لنکن شائر جاؤ اور جس طرح بھی ہو انہیں منا کر یہاں لے آؤ۔''

وہ ملازم خط میں لکھے ہوئے پتے پر پہنچا۔ اسے یہ سن کر سخت مایوسی ہوئی کہ وہ یہاں سے بھی کہیں چلا گیا ہے کسی کو نہیں معلوم کہ کہاں۔ روسو کو شاید جانا ہی تھا۔ اس نے جان بوجھ کر خط لکھا تھا کہ کوئی اسے ڈھونڈنے ضرور آئے گا۔ اور وہ اس وقت تک آگے بڑھ چکا ہوگا۔ اس کا ذہنی مزاج اب ایسے ہی کھیل تماشوں میں خوش ہونے لگا تھا۔

ڈیون پورٹ کا ملازم مایوس ہوکر واپس چلا گیا تھا اور روسو ڈوور پہنچ گیا تھا۔ یہ وہی بندرگارہ تھی جہاں وہ کبھی ہیوم کے ساتھ فرانس سے لندن آنے کے لیے جہاز سے اترا تھا اور اب فرانس جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ کوئی دشمن اس کے پیچھے نہیں لگا ہوا تھا لیکن وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ دشمن اس کے تعاقب میں ہیں۔ جہاں دیکھیں گے مار دیں گے۔ یہی نہیں بلکہ اسے انگلستان سے جانے بھی نہیں دیں گے۔ وہ دن بھر چھپا رہا اور رات کے وقت اندھیرے میں اندھیرا بن کر ایک کشتی میں سوار ہوگیا اور کسی نہ کسی طرح فرانس پہنچ گیا۔

وہ اتنی جلدی میں نکلا تھا کہ یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ فرانس کی پارلیمنٹ نے اس کی گرفتاری کا جو فیصلہ کیا تھا وہ جوں کا توں ہے۔ اس کو فرانس آنے کی رسمی اجازت ملی تھی، فیصلہ برقرار تھا پھر وہ ہیوم کے ساتھ لندن چلا گیا تھا۔ اسے کسی بھی وقت گرفتار کیا جاسکتا ہے، اس کا علم تو اسے پیرس پہنچنے کے بعد ہوا اور اب وہ روپوش ہونے کے لیے جگہ ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ ان حالات میں اس کا پرانا دوست پرنس آف کونٹی اس کے کام آگیا۔ دیہی علاقے میں اس کی ایک حویلی تھی۔ اس نے اپنی حویلی کے دروازے روسو پر کھول دیئے۔ اسے ایک مرتبہ پھر شہر کے ہنگاموں سے دور، فطری مناظر کے قریب قدرتی مناظر سے آنکھ مچولی کھیلنے کا موقع مل گیا۔ ذرا پاؤں پھیلائے تو اسے اپنی سوانح ''اعترافات'' لکھنے کا خیال آیا۔ یہ کام وہ لندن ہی میں شروع کر چکا تھا۔ اس نے خوبصورت ربن میں بندھے ہوئے کاغذ نکالے اور لکھنے بیٹھ گیا، یہاں کوئی اسے تنگ کرنے والا نہیں تھا۔ وہ لکھتا رہا پرندوں اور چڑیوں سے باتیں کرتا رہا۔ فرصت کے لمحات میں پودوں سے سرگوشیاں کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ حویلی کے ملازم اسے چڑیوں سے باتیں کرتے ہوئے دیکھتے تو اسے خبط الحواس بوڑھا سمجھ کر دل ہی دل میں ہنستے رہتے۔

اب اس کے حواس تو بحال ہونے لگے تھے لیکن دل وہموں سے خالی نہیں ہوا تھا۔ یہاں اسے کسی سے خطرہ نہیں تھا بلکہ ذہنی حالت بگڑی تو اسے حویلی کے ملازموں پر ہی شک ہونے لگا۔ اسے یہ وہم پیدا ہوگیا کہ اس کے ہمسائے، ملازم، حویلی کے مالی سب کے سب ہیوم کے ساتھ مل گئے ہیں، اس کی جاسوسی کرتے ہیں، دن رات اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ وہ جب پیڑ، پودوں سے باتیں کرتا اور ملازم چھپ چھپ کر اسے دیکھتے تو وہ یہی سمجھتا کہ وہ اس کی جاسوسی کررہے ہیں اور کسی وقت اس پر حملہ بھی کرسکتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو کمرے میں بند کرلیتا۔ اس وقت اس کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ تھرتھر کانپنے لگتا تھا۔ ایسے میں ٹریزے کی مصیبت آجاتی۔

''تم بھی دیکھ بھال کر باہر نکلنا۔ ان میں سے کوئی تم پر بھی حملہ کرسکتا ہے۔'' وہ سرگوشی میں کہتا۔

''یہ ملازم ہیں، انہیں بھلا تم سے کیا دشمنی۔''

''مجھے لگتا ہے تم بھی ہیوم کے ساتھ مل گئی ہو۔ اسی لیے ان کی طرفداری کررہی ہو۔''

''میں تو تمہارے ساتھ ہوں روسو۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ احتیاط کرو سب لوگ مجھ سے جلتے ہیں۔ تم سے بھی جلتے ہیں۔''

ٹریزے کی نصیحتوں کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ پہلے کی طرح یہاں سے بھی بھاگنے کی سوچنے لگا۔ بے چاری ٹریزے اس کا تعاقب کرتے کرتے تھک چکی تھی لیکن روسو کے پاؤں کا چکر ختم ہونے والا نہیں تھا۔ ایک دن وہ یہاں سے بھی بھاگ نکلا۔ اس کا سفر جمیری کی طرف تھا جہاں کی پرانی یادیں اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں، وہ گرے نوبل کے مقام تک پہنچا تھا کہ ایک عجیب مصیبت میں پھنس گیا۔ ایک شخص نے سرراہ اسے پکڑلیا اس کا دعویٰ تھا کہ روسو نے کچھ رقم اس سے بطور قرض لی تھی اور لوٹانے سے قاصر رہا ہے اس کی رقم اسے دلائی جائے۔ روسو کچھ بھی کرسکتا تھا کسی کی رقم نہیں کھا سکتا تھا۔ وہ شخص جھوٹا تھا بات عدالت تک گئی اور اس شخص کو اپنے جھوٹ کا اقرار کرنا پڑا۔ معاملہ رفع دفع ہوگیا لیکن روسو نے اس معاملے کو بھی ہیوم اور اپنے دوسرے مخالفوں کے کھاتے میں ڈال دیا کہ اس شخص کو انہی لوگوں نے بھڑکایا ہوگا۔

وہ گرے نوبل سے نکلا اور ریت میں اڑنے والے بگولوں کی طرح اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ اس نے فرض کرلیا تھا کہ لوگ اس کے تعاقب میں ہیں لہٰذا وہ انہیں دوڑا رہا تھا۔ کبھی ایک شہر میں پہنچتا، ایک رات وہاں گزارتا پھر کسی دوسرے علاقے میں پہنچ جاتا وہ کسی بے چین روح کی طرح بھٹکتا پھر رہا تھا۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ دشمن اگر اندھیرے میں ہو تو اس پر حملہ نہیں کیا جاسکتا، بس آدمی ایک مشکل دفاع سے گزر سکتا ہے۔ وہ بھی اپنا دفاع کررہا تھا۔ یہ دفاع مقابلے میں نہیں فرار میں مضمر تھا۔ اسے سکون کی تلاش تھی مگر اس کے خیال کے مطابق ہر طرف سازشوں کے جال بچھے ہوئے تھے۔

اس کے جذبے لہولہان ہوگئے تھے۔ دیواروں سے سر پھوڑتے پھوڑتے اس کا ماتھا زخمی ہوگیا تھا۔ وہ تھک چکا تھا۔ وہ ہر راستے پر جا کر دیکھ چکا تھا۔ ہر شاہراہ اس کے لیے بند گلی بن گئی تھی۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس طرف نکل گیا ہے پھر کسی نے اسے پیرس میں گھومتے ہوئے دیکھا، شاید اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اس کے قدردان اسی شہر میں ہیں لہٰذا وہ پیرس آگیا۔

اس کے رویوں میں قدرے اعتدال نظر آرہا تھا۔ پرانے دوستوں نے اسے ایک مرتبہ پھر ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کی طبیعت میں بھی قدرے تبدیلی نظر آرہی تھی۔ اب وہ پہلے جیسا مردم بیزار نہیں تھا۔ کافی ہاؤس اس کے دم سے آباد ہونے لگے۔ اس کی دلچسپ باتیں ایک مرتبہ پھر پیرس کی ادبی محفلوں میں گونجنے لگیں۔

اس مرتبہ وہ خود ہوش میں آگیا تھا مگر دوسروں کے ہوش

اڑانے پیرس آیا تھا۔ اس کا علم اس وقت ہوا جب اس نے بعض حلقوں میں اپنی سوانح عمری ''اعترافات'' کے بعض حصے پڑھ کر سنائے۔ لوگوں میں سنسنی پھیل گئی۔ اس نے اتنی بے دردی سے کلام کیا تھا۔ اتنی سفاکی سے لوگوں کے راز کھولے تھے کہ لوگ ڈر گئے۔ ایک مرتبہ پھر اس کے خلاف طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ جن لوگوں نے آگے بڑھ کر اسے خوش آمدید کہا تھا۔ پیچھے ہٹ گئے جہاں چند لوگ جمع ہو جاتے اس کے خلاف باتیں شروع ہو جاتیں۔ وہ ایک بار پھر اکیلا رہ گیا۔

وہ اکیلا تھا مگر اس کی شہرت کے ہجوم ہر وقت اس کے ساتھ تھے۔ بحر اوقیانوس کے پار امریکا تک میں اس کی کتابیں پڑھی جا رہی تھیں۔ امریکی نوجوان اور مدبر اس کے خیالات سے استفادہ کر رہے تھے۔ اسے ہر جگہ اعلیٰ درجے کا فلسفی تسلیم کیا جا رہا تھا۔

وہ پیرس میں تنہائی کی زندگی گزار رہا تھا۔ موسیقی کے مسودے تیار کر کے روزی پیدا کر رہا تھا۔ پودوں کا مطالعہ کرتا یا کسی سستے سے کیفے میں بیٹھ کر کافی پینے کے لیے بازار چلا جاتا۔ رات کو دیر تک مطالعہ کرتا اور صبح اٹھنے کے لیے سو جاتا۔ اس کی اس خاموش زندگی میں اس وقت ایک پتھر آ کر گرا جب پولینڈ کے حکمرانوں نے اس سے رابطہ کیا اور اپنے ملک میں ہونے والی خانہ جنگیوں سے نمٹنے کے لیے اس سے تجاویز طلب کیں۔ اس کی زندگی میں پھر ایک مصروفیت آ نکلی۔ ''پولینڈ کی حکومت پر غور و فکر'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون میں اس نے پولینڈ کے حکمرانوں کو اشارہ دیا تھا کہ ہمسایہ ملک ان کے بعض علاقوں پر نظریں جمائے ہوئے ہیں اور ان پر قبضہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اسی طرح اس نے پولینڈ میں فیڈریشن کے قیام کی تجویز دی تھی۔

اس مضمون پر جم کر کام کرنے کی وجہ سے اس کی زندگی میں خوش گوار تبدیلی آئی۔ اسے ایک طویل کاہلی سے نجات ملی تھی۔ اس نے اسے قائم رکھا اور ''مکالمات'' لکھنے بیٹھ گیا جو اس کی سوانح عمری ہی کا ایک حصہ تھے۔

اس کے جھگڑالو پن کی وجہ سے پرانے دوستوں نے ملنا ترک کر دیا تھا اور نئے لوگوں کو وہ خود قریب نہیں آنے دے رہا تھا۔ تنہائی تھی اور خیالات کے ہجوم جو اس پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ غربت نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ وہ اب اس منزل پر تھا کہ اپنی زندگی عیش و عشرت میں ڈھال سکتا تھا لیکن شاید غربت کی زندگی میں اسے لطف آنے لگا تھا۔ شاید یہ بھی اس کی نفسیاتی کیفیت کا حصہ ہو۔ اس لیے کہ وہ بعض مواقع خود ضائع کر دیتا تھا۔ انگلستان کے بادشاہ نے جو وظیفہ اس کے لیے مقرر کیا تھا۔ اس کی رقم جمع ہوتے ہوتے چھ ہزار فرانک تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے حالات سے متاثر ہو کر اس کے ایک دوست نے رقم کی ادائیگی کے لیے اپنے طور پر روسو کی طرف سے درخواست بھیج دی۔ اس پر انگلستان کی حکومت نے رقم کا ڈرافٹ جاری کر دیا۔ روسو کو تو اس وقت معلوم ہوا جب یہ ڈرافٹ اسے موصول ہوا۔ وہ اس رقم سے اپنے بہت سے کام نکال سکتا تھا لیکن وہ تو یہ سوچنے بیٹھ گیا کہ یہ رقم اس تک پہنچی کیسے۔ اس نے کوئی درخواست نہیں بھیجی پھر یہ کیوں لکھا جا رہا ہے کہ آپ کی درخواست کے جواب میں ڈرافٹ روانہ کیا جا رہا ہے۔ اس کا خیال کئی دوستوں کی طرف گیا اور بالآخر اسے معلوم ہو گیا کہ اس کے کسی دوست نے اس کی طرف سے درخواست لکھی تھی۔ اس نے احسان مند ہوئے کے بجائے اس دوست سے جھگڑا کیا اور ڈرافٹ پھاڑ کر پھینک دیا۔ اب ایسے سر پھرے کا ساتھ کون دیتا۔

وہ ابھی غربت سے لڑنے میں مشغول تھا کہ اس نے اپنے خلاف ایک محاذ اور کھول لیا۔ یہ محاذ ایسا تھا کہ جس نے بھی اس کا نام سنا تھا وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ ابھی تک ٹریزے کے ساتھ شادی کے بغیر رہتا چلا آیا تھا۔ پوری جوانی اسی طرح گزاری تھی، اس نے ہر طنز، ہر طعنہ برداشت کیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے کسی کی پروا نہیں۔ اب وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ غربت کی آگ نے اسے مزید بوڑھا کر دیا تھا۔ جسمانی صحت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ اپنی عمر سے زیادہ نظر آتا تھا۔ اس مرحلے پر اس کے ٹریزے سے باقاعدہ شادی کرنے کے اعلان نے سب کو حیران کر دیا، ٹریزے بھی اب بوڑھی ہونے لگی تھی۔ اس عمر میں جب وہ دلہنوں کے لباس میں روسو کے ساتھ گرجا گئی تو ہجوم سے سڑکیں بھر گئیں۔ پادریوں کو خوشی تھی کہ بالآخر ایک آزاد خیال فلسفی اس مذہبی فریضے کو انجام دینے پر آمادہ ہو ہی گیا۔ دوست بھی خوش ہوئے کہ روسو زندگی کی طرف واپس آ رہا ہے۔

اس کی خوشی چند دن بعد ہی دم توڑ گئی۔ جب ٹریزے نے اس سے زوردار جھگڑا کیا۔ ایسی لڑائی اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ٹریزے اور وہ اکثر الجھتے رہتے تھے لیکن اس مرتبہ ٹریزے کے تیور ہی دوسرے تھے۔ اس کی وجہ مفلسی تو تھی ہی لیکن اس سے بھی بڑی وجہ یہ تھی کہ اب ٹریزے کو یقین آ گیا تھا کہ وہ روسو کی قانونی بیوی ہے۔ اس سے پہلے اس کا احساسِ جرم مجبور کرتا تھا کہ وہ روسو سے ڈرتی رہے۔ اب یہ کانٹا نکل چکا تھا۔ اب روسو کو بھی احساس ہوا کہ اس نے شادی نہیں کی

ارب پتی اور امیر ترین افراد

دنیا میں سب سے زیادہ ارب پتی افراد امریکا میں ہیں جنکی تعداد 55 کے قریب ہے پھر جاپان اور جرمنی جہاں بالترتیب 43 اور 42 کی تعداد میں ارب پتی افراد ہیں۔ کینیڈا اور برطانیہ کے ارب پتی افراد کی تعداد برابر ہے جو 15 ہے۔ اسی طرح فرانس اور سوئٹزر لینڈ میں یہ تعداد 14`14 ہے۔

دنیا کے امیر ترین افراد بھی سب سے زیادہ امریکا میں ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا کا امیر ترین فرد ولیم ایچ گیٹس ہے جس کے اثاثوں اور دولت کا اندازہ 63 ارب ڈالر ہے اسی طرح سعودی عرب کا شہزادہ الولید اپنے 20 ارب ڈالر کے اثاثوں کے ساتھ چھٹی پوزیشن پر ہے اور جرمنی کے تھیو اینڈ کارل 19 ارب ڈالر کی دولت کے ساتھ ساتویں پوزیشن پر۔

وہ کیا کہتے ہیں کہ ”ہل من مزید“

مرسلہ: یونس بلوچ، جرمنی

ایک محاذ کھول لیا ہے۔

ٹریزے کی جسمانی حالت بھی اب ایسی نہیں رہی تھی کہ وہ روسو کی دیکھ بھال کر سکتی۔ اس کی ماں کا بھی انتقال ہو چکا تھا جو اس کے گھر کے انتظامات سنبھالتی تھی، مفلسی ایسی تھی کہ دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں ہو رہی تھی۔ تعلقات ایسے کشیدہ ہو گئے تھے کہ ایک گھر میں رہتے ہوئے وہ مہینوں ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے۔ ایسے دوستوں کی کمی نہیں تھی جو اس کی مدد کر سکتے تھے لیکن اس کی بے جا خودداری کسی کی مدد قبول کرنے پر تیار نہیں تھی۔ حالات روز بہ روز ناگفتہ بہ ہوتے جا رہے تھے اور اب تو اسے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ اگر وہ مر گیا تو کوئی اسے دفنانے والا بھی نہیں ہوگا۔

اس کی بے چین طبیعت عجیب عجیب رنگ دکھا رہی تھی۔ ایک طرف تو یہ عالم تھا کہ وہ کسی کا احسان اٹھانے پر تیار نہیں تھا دوسری طرف دنیا نے یہ دیکھا کہ بہت سے لوگوں کو روسو کی طرف سے یہ خط موصول ہوا۔

”وہ اور اس کی اہلیہ ناگفتہ بہ حالات میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اب دونوں کے لیے کسی محتاج خانے میں پناہ لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے اور ٹریزے کو کسی محتاج خانے میں جگہ دلوا دی جائے جہاں ہم باقی زندگی آرام سے گزار سکیں۔“

جس نے بھی یہ خط پڑھا ششدر رہ گیا۔ اتنا عظیم فلسفی ایسی کرب ناک زندگی گزار رہا ہے کہ خود محتاج خانے میں پناہ لینے کی درخواست دے رہا ہے۔ کیا فرانس میں کوئی ایسا نہیں جو اسے زندگی کی چند سہولتیں دے سکے؟ کچھ دوست پھر آگے بڑھے لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ کسی دوست کی مدد قبول کرنے کو تیار نہیں۔ دراصل اس کی وہمی طبیعت نے دوستوں پر سے اس کا اعتماد اٹھا دیا تھا۔ وہ ان کی مدد کو ٹھکرا کر کسی محتاج خانے میں رہنے کو ترجیح دے رہا تھا۔ یہ فعل اس کی روحانی خوشی کا باعث تھا۔

دوستوں نے کوششیں جاری رکھیں اور بالآخر اس کے ایک دوست نے اسے آمادہ کر لیا کہ وہ پیرس سے بیس میل دور ارمنو ویل کے قصبے میں رہائش اختیار کر لے۔ 20 مئی 1778ء کو روسو وہاں منتقل ہو گیا۔

ایسے قصبے، دیہی ماحول، فطری مناظر اس کے مزاج کا حصہ تھے۔ یہاں پہنچ کر اس کا جی لگ گیا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی طبیعت سنبھلنے لگے گی۔ رہائش گاہ کے ملازم اس کی اور ٹریزے کی خدمت کے لیے موجود تھے۔ سیر و تفریح کے لیے یہاں بہت سے مقامات تھے لیکن اب وہ ٹریزے کی صحبت سے محروم تھا۔ دونوں کے تعلقات اتنے کشیدہ تھے کہ اب وہ اسے لے کر سیر کرنے کے بھی نہیں جاتا تھا اور صبح کی سیر کے لیے وہ اکیلے ہی گھر سے نکل جاتا۔

اس کی یہ خوش خرامی محض چند روز جاری رہی۔ یہاں آنے کے کچھ ہی دن بعد وہ پھر اس وہم میں مبتلا ہو گیا کہ اسے کسی سازش کے تحت یہاں قید کر دیا ہے اور اس کے دوست نے دوستی کے پردے میں دشمنی کی ہے۔ اس سے تو اچھا یہی تھا کہ وہ کسی محتاج خانے چلا جاتا۔ یہ وہم بڑھتا گیا یہاں تک کہ اس نے صبح کی سیر کے لیے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ اسے یہ وہم کھائے جا رہا تھا کہ کوئی اس کا تعاقب کرتا ہے۔ اکیلے میں کہیں حملہ نہ کر بیٹھے۔ اسے شاید ٹریزے پر بھی بھروسا نہیں رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بھی باہر نکلنے سے گریز کر رہا تھا۔

ایک روز دل ایسا گھبرایا کہ صبح کی سیر کو نکل کھڑا ہوا۔ سیر کے بعد واپس آیا تو سر میں درد کی شکایت کی اور پھر بستر پر گر گیا۔ ٹریزے نے بگڑی ہوئی حالت کو دیکھا تو ملازموں کو دوڑایا۔ جتنی دیر میں ڈاکٹر آتا، یہ فلسفی موت کی آغوش میں جا چکا

تھا۔ 2 جولائی 1778ء کو اس کے پاؤں کا چکر ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ وہ زندگی بھر اپنے خود ساختہ دشمنوں سے بھاگتا رہا تھا لیکن اب بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔

شہرت کی آخری حدوں کو چھونے والا روسو اپنے پرستاروں کی غیر موجودگی میں ایک دور افتادہ قصبے میں نہایت خاموشی سے مرگیا۔ اس کی موت پر رونے والا کوئی نہیں تھا۔

اسے اس کی خواہش کے مطابق اس قصبے کی جھیل کے کنارے دفن کر دیا گیا۔ موسم گرما کی چاندنی رات تھی جھیل کے ساکن پانی پر درختوں کے سائے بل کھا رہے تھے۔ قصبے کے چند افراد اسے دفن کر کے واپس آ رہے تھے۔ ٹریزے گھر میں اکیلی تھی۔

اس کی اچانک موت نے افواہوں کے دروازے کھول دیے۔ کئی سوال سامنے آئے اس کی موت طبعی تھی؟ خودکشی تھی یا خود ٹریزے نے اسے زہر دے کر ہمیشہ کے لیے دکھوں سے نجات دلا دی۔

مادام دے سٹیل نے اس پر ایک مضمون لکھا۔ اس کی ذہانت و فطانت تک تو بات ٹھیک تھی لیکن اس نے روسو کی موت کا سبب خودکشی کو ٹھہرایا۔ بقول مادام کے ''اس کے حالات اور جسمانی حالت ایسی تھی کہ وہ خودکشی پر مائل ہو سکتا تھا۔'' زندگی کے آخری برسوں میں وہ خود کہنے لگا تھا کہ جب جسمانی یا ذہنی عوارض مسلسل ناقابلِ برداشت ہوتے چلے جائیں اور ان کا علاج ممکن نہ رہے تو پھر فرد ان سے نجات پانے کے لیے اپنی جان لے سکتا ہے۔ لہٰذا اس خیال نے اس کی موت کو خودکشی سمجھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ہر طرف یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ خود ٹریزے کی طرف بھی انگلیاں اٹھ رہی تھیں خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ کچھ دنوں سے دونوں میاں بیوی کے حالات کشیدہ تھے۔ جب یہ افسانے مسلسل گردش کرنے لگے تو ڈاکٹروں سے رجوع کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے سرٹیفکٹ جاری کیا کہ روسو کی موت دماغ کی شریان پھٹنے کی وجہ سے ہوئی۔ اس شخص نے بھی بیان جاری کیا جس کے گھر میں روسو کا انتقال ہوا تھا کہ روسو کے جسم پر گولی لگنے یا زہر پینے کی کوئی علامت نہیں تھی۔ ان بیانات اور ڈاکٹروں کی گواہی کے باوجود عرصۂ دراز تک اس کی خودکشی کے افسانے گردش کرتے رہے۔

☆☆☆

فرانس بہ ظاہر خوش تھا لیکن چنگاریاں اندر ہی اندر سلگ رہی تھیں۔ پاپائیت کے خلاف غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ جاگیرداری کے خلاف نفرت کی ہوائیں چلنا شروع ہو گئیں تھیں۔ روشن خیالی کے امکانات کا جائزہ لیا جا رہا تھا۔ انقلاب کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ لگتا تھا طویل کشمکش کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ والتیئر اور روسو دونوں کا انتقال ہو چکا تھا لیکن ان کا برپا کردہ ذہنی انقلاب عملی صورت اختیار کرنے کے لیے بے چین تھا۔

اس کی وفات کے صرف دس سال بعد 1789ء میں انقلابیوں نے فرانس پر قبضہ کر لیا یہ ایک عظیم الشان انقلاب تھا جس نے امرا سے اقتدار چھین کر بورژوا طبقے کے حوالے کر دیا۔ اس انقلاب کے لیے زمین ہموار کرنے والے بہت سے تھے لیکن عوام کے ذہنوں میں بس دو نام نقش تھے۔ ایک والتیئر دوسرا روسو۔

انقلاب کے بعد در بدر پھرنے والے اس فلسفی کو دیوتاؤں جیسا درجہ دیا گیا۔ انقلابی کونسل نے عقیدت کے اظہار کے لیے اس کے جسدِ خاکی کو قومی قبرستان میں دفن کرنے کا اعلان کیا۔

ایک پروقار تقریب کے بعد توپوں کے گھن گرج اور ڈھولوں کی تھاپ میں اس کی خاک کو اٹھایا گیا اور عظیم افراد کے قومی قبرستان میں پہنچا دیا گیا۔

اس کی پذیرائی ہوا اور کسی کو ٹریزے کا خیال نہ آئے' یہ کیسے ممکن تھا۔ ٹریزے کے لیے بارہ سو فرانک کا سالانہ وظیفہ جاری کیا گیا۔ بکھرے ہوئے روسو کو اگر ٹریزے نہ سمیٹتی تو وہ وقت سے بہت پہلے مر چکا ہوتا۔ یہ وظیفہ ٹریزے کی اسی خدمت کے اعتراف میں تھا۔ فرانس کے کئی شہروں میں روسو کے مجسمے نصب کیے گئے۔ یہ وہ مقامات تھے جہاں کبھی روسو نے قیام کیا تھا۔

☆☆☆

ٹریزے ابھی تک ارمنو ویل کے قصبے میں تھی جہاں روسو کا انتقال ہوا تھا۔ مفلسی کے طویل دس برس گزارنے کے بعد جب اسے وظیفہ ملنے لگا' روسو کی کتابوں کی رائلٹی بھی حاصل ہونے لگی تو وہ اچانک مال دار ہو گئی لیکن اس میں اتنا سلیقہ تھا ہی نہیں کہ وہ اس رقم کو سنبھال کر رکھتی۔ وقت گزرتا رہا وہ حویلی کے ادنیٰ ملازموں پر بے دریغ خرچ کرتی رہی۔ حادثات زمانہ نے وظیفے کی رقم بند کرا دی۔ جن پر خرچ کرتی رہی تھی انہوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت ایک تھیٹر کے دروازے پر تماش بینوں سے خیرات مانگ رہی ہے۔ بہت کم لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ یہ روسو کی بیوہ ٹریزے ہے۔